BROWN
BOOK ONLY

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد ۲۳

نمبر ۳

"ہمایوں" بابت ماہِ مارچ ۱۹۳۳ء

تصویر:۔ روما کی ایک خونین تماشاگاہ

قیمت فی پرچہ ۶/ ویلر بک سٹال پر ۸/ چندہ سالانہ للعہ مع محصول

جہاں نما

دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ

موجودہ زمانے میں عموماً اس مسئلہ پر کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ذریعۂ تعلیم دیسی زبانیں ہونی چاہئیں لیکن ہندوستان کی صورت ہی اور ہے۔ یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے سوا جہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے اور کسی یونیورسٹی نے کسی دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا۔ نیشنل کرسچین کونسل ریویو نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہندی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبے میں جو موجودہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی روایات کے خلاف ہندی زبان میں پڑھا گیا پنڈت مالوی نے مدرسوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم کے سوال کو بجا طور پر اٹھایا ہے۔ انہوں نے کہا یونیورسٹی کے سنٹرل ہندو سکول میں طلبہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور آئندہ سال سے انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں بھی ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو جائے گی۔ یہ ایک نہایت اہم اور قابل ذکر اصلاح ہے۔ باقی دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں ملکی زبانیں ذریعۂ تعلیم ہیں۔ لیکن ہندوستان کی سولہ یونیورسٹیوں میں سے صرف ایک ریاست حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ایسی ہے جس نے بہ غیر مشکوک طور پر صحیح اور مناسب طریق تعلیم اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ پنڈت مالوی نے اپنی تقریر میں کہا دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کا طریق انگریزی زبان کا کما حقہٗ مطالعہ کرنے کے منافی نہیں ہے۔ جس کا ثبوت ہمیں عثمانیہ یونیورسٹی سے مل چکا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی باقی یونیورسٹیاں بھی حیدرآباد اور بنارس کی مثال کی پیروی کریں گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ گزشتہ سال اس موضوع پر انٹر یونیورسٹی بورڈ نے ایک گشتی مراسلہ شائع کیا تھا جس کے جوابات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان مشکلات پر غالب آنا غیر ممکن نہیں۔ اصلاح و تجدید کے امکان کو ایک مناسب موقع نہ دینے کی ذمہ داری اتنی مشکلات پر عاید نہیں ہوتی جتنی طبیعتوں کی اس کج روی اور بیدلی پر عاید ہوتی ہے جو ایک مروجہ طریق سے انحراف پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی تمام مضامین میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں اس لئے کامیاب ہو سکی ہے کہ یونیورسٹی کے قائم کردہ دار الترجمہ کی شبانہ روز کوششیں اور فاضل و ماہر مصنفین کی قابل قدر خدمات اس کے شامل حال تھیں۔ اس انقلاب انگیز طریقے کا جس پر اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی میں عمل ہو رہا ہے اور اس نئی تحریک کا جو عثمانیہ یونیورسٹی کے اصول پر اب بنارس یونیورسٹی میں رائج کی جائے گی ان لوگوں کو بہ نظر امعان مطالعہ کرنا چاہئے جو ہندوستان میں مسیحیوں کی اعلیٰ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

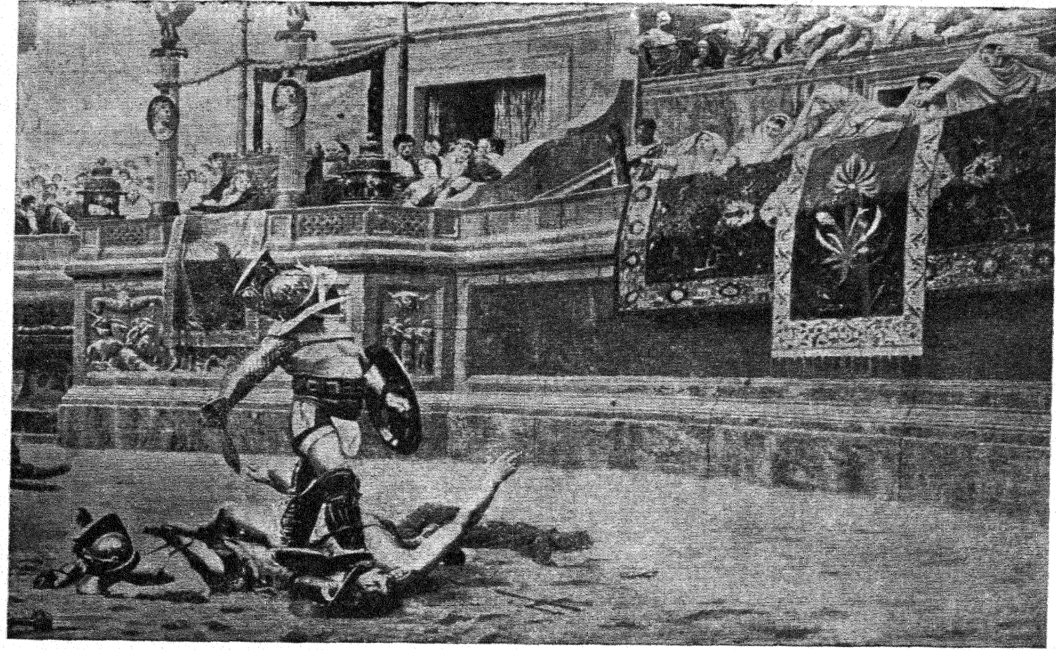
قسمت اور نیند کے متعلق اڈیسن کے خیالات

مسٹر ایم اے ریسناف جو اڈیسن کے ساتھ ایک مددگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں مندرجۂ ذیل شذرے میں اس عظیم الشان حکیم کی کامیابی کا راز اس کے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ایک دن ہم بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ مسٹر اڈیسن نے کہا "کیا تم قسمت کے قائل ہو"؟ میں نے کہا ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میری عقل مجھے قسمت کے وہم کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے لیکن میری وحشی روح مجھے اس سے جدا ہونے نہیں دیتی۔ اڈیسن نے کہا "مجھ سے پوچھو تو میں تو قسمت کا قطعاً قائل نہیں ہوں۔ اور اگر قسمت حقیقت میں کوئی چیز ہے تو میں دنیا میں سب سے بڑھ کر بدقسمت آدمی ہوں۔ اپنی تمام عمر میں ایک دفعہ بھی قسمت نے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے ہر اُس چیز کی تلاش کرنی پڑتی ہے جس کی مجھے ضرورت نہیں ہوتی۔ یا ہر رطب و یابس میں سے ہو کر مجھے گزرنا پڑتا ہے۔ ننانوے چیزیں میری راہ میں ایسی آتی ہیں جو میرے لئے بے مصرف ہوتی ہیں اور اس کے بعد آخر میں اُس چیز کی باری آتی ہے جس کی میں تلاش میں ہوتا ہوں کیا تم اسے بدقسمتی نہ کہو گے؟ لیکن میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں قسمت کا قائل نہیں۔ نہ اچھی کا نہ بُری کا۔ بات یہ ہے ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ ایک دو مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اپنے مقصد کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اپنے مقصد کو اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک میں نے اسے حاصل نہ کر لیا۔ یہی ایک فرق ہے جو مجھ میں جسے لوگ خوش قسمت خیال کرتے ہیں اور اُن لوگوں میں ہے جو اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مجھ میں کوئی خاص جوہر ہے جس کے زور سے میں نے اپنی بڑی بڑی ایجادیں کی ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ ہر صاحب فہم وہ کام کر سکتا ہے جو میں نے کیا بشرطیکہ وہ پنجے جھاڑ کر اپنے مقصد کے پیچھے پڑ جائے اور سمجھے کہ میں اسے تکمیل تک پہنچا کر چھوڑوں گا۔ تم نے میرا یہ قول لوگوں سے سُنا ہوگا کہ قابلیت کا جوہر ایک فیصدی الہام پر اور ننانوے فیصدی محنت پر مشتمل ہوتا ہے۔ میں نے کہا "ہاں صاحب، دراصل محنت ہی سب کچھ ہے۔ لیکن یہ آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ کم از کم آپ غیر معمولی صبر و استقلال کے مالک ہیں" انھوں نے کہا "ہاں یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے بڑا صبر ملا ہے۔"

نیند کے متعلق بھی اڈیسن کے خیالات کچھ کم دلچسپ نہیں شاید اپنے اسی نظریے کے طفیل وہ متواتر کئی کئی راتیں بغیر سونے کے کام میں گزار دیتے تھے یا برائے نام سو لیتے تھے۔

نظریۂ خواب اُن کا محبوب موضوعِ گفتگو تھا۔ وہ بار بار اس پر آجایا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا "نیند محض ایک عادت ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل نہیں۔ خلیات نہیں سوتے۔ مچھلیاں تمام رات پانی میں تیرتی رہتی ہیں، وہ نہیں سوتیں۔ گھوڑا بھی نہیں سوتا۔ وہ کھڑا رہ کر آرام کر لیتا ہے۔ انسان کو نیند کی کچھ ضرورت نہیں۔ تم کبھی اس کا تجربہ کرو۔ تمام دن اور تمام رات کام کرتے رہو، پھر علی الصباح صرف آدھ گھنٹے کے لئے ذرا سستا لو، اس کے بعد اٹھو۔ اپنا منہ



رومہ کی ایک خونیں تماشا گاہ

ٹھنڈے پانی سے دھو کر پھر اپنے کام میں لگ جاؤ تمہیں کوئی تکان محسوس نہ ہوگی اور تم بالکل تر و تازہ ہو جاؤ گے۔

ناخواندگی

ہر ملک کے ناخواندہ اشخاص کی تعداد حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ ڈیکر کی ۱۹۳۳ء کی جنتری میں ہمیں مندرجۂ ذیل نقشہ ملا ہے:۔

ناخواندہ اشخاص کی نسبت آبادی سے

ترکی سنہ ۱۹۲۷ء ۹۱ر۸ فیصدی	ہندوستان سنہ ۱۹۲۱ء ۹۰ر۰ فیصدی	مصر سنہ ۱۹۲۷ء ۸۵ر۷ فیصدی
برازیل سنہ ۱۹۲۰ء ۶۷ر۰ ؍؍	پرتگال سنہ ۱۹۲۰ء ۶۵ر۰ ؍؍	میکسیکو سنہ ۱۹۲۱ء ۶۲ر۹
سوویٹ یونین سنہ ۱۹۲۶ء ۴۸ر۷ ؍؍	سپین سنہ ۱۹۲۰ء ۴۳ر۰ ؍؍	یونان سنہ ۱۹۲۸ء ۴۳ر۰

پولینڈ سنہ ۱۹۲۱ء ۳۲ر۷ فیصدی اٹلی سنہ ۱۹۲۱ء ۲۶ر۸ فیصدی

کتابوں کے پچپن میل

برٹش میوزیم کی مشہور و معروف لائبریری کی چالیس لاکھ کتابوں کی ایک نئی فہرست تیار ہو رہی ہے۔ یہ کتابیں جن طاقچوں میں پڑی ہوئی ہیں اُن کو اگر مسلسل جوڑا جائے تو ایک پچپن میل لمبی قطار تیار ہو سکتی ہے گزشتہ فہرست کی ترتیب کو تریپن سال گزر چکے ہیں اور اس کی تیاری کے لئے عملہ پچیس سال تک مصروف رہا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ فہرست کی تیاری پر بھی ایک بہت لمبا عرصہ صرف ہو جائے گا۔ اب تک کہ دو سال گزر چکے ہیں صرف اُن مصنفین کی آدھی کتابوں کی فہرست تیار ہو سکی ہے جن کے نام ابجد کے پہلے حرف سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ فہرست تکمیل پر تقریباً ۱۲۵ اجلدوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کی قیمت چار سو پونڈ ہوگی اور دنیا بھر کی تمام اعلیٰ درجے کی لائبریریوں کا ایک ضروری جزو سمجھی جائے گی۔

تصویر۔ (روما کی ایک خونین تماشا گاہ) یہ تصویر انسان کے عہدِ بربریت کی ایک عبرت آموز یادگار ہے۔ جسے فرانس کے نامور مصور (Hector Leroux) کے کمالِ فن نے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اس قسم کی بہیمانہ تفریحات کا آغاز یوں تو بہت قبل ہو چکا تھا لیکن سیزروں کے زمانۂ حکومت میں خاص طور پر اس ننگِ انسانیت کھیل کو فروغ حاصل ہوا۔ روما کے خون آشام آقا اپنے غلاموں کو ایک زبردست کشتی کرنے کیلئے اس قسم کے دنگلوں میں لایا کرتے تھے۔ ان غلاموں کو گلیڈیٹر کہتے تھے جو غلام اپنے حریف کو پچھاڑ لیتا وہ تماشائیوں کا ایما معلوم کرنے کے لئے اوپر نظر اٹھاتا۔ خونخوار تماشائی جن میں عورتیں بھی شامل ہوتیں اپنے دہنے ہاتھوں کے انگوٹھے نیچے کی طرف جھکا دیتے۔ یہ ایک خوفناک خونیں اشارہ تھا جسے پاتے ہی گلیڈیٹر طرفۃ العین میں اپنے برگشتہ بخت حریف کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

عشق

تم مجھ سے کہاں بھاگ کے جاؤ گے بتاؤ
چھایا ہوں میں ہر سمت جدھر آنکھ اٹھاؤ

میں چشمِ ازل، چشمِ ابد، چشمِ بقا ہوں
موجِ نگہِ کاہکشاں بن کے اٹھا ہوں

ہے بوسۂ مہتاب سے تاباں رخِ ہستی
آفاق کے چہرے پہ ہے چھائی ہوئی مستی

میں دیدۂ انجم سے تمہیں جھانک رہا ہوں
وہ نور کا طوفاں ہوں جدھر جاؤ بپا ہوں

نکہت ہے مرے سانس کی ہر موجِ صبا میں
اک کیف سا پیدا ہے دلِ ارض و سما میں

میں تابِ رخِ حسن ہوں میں روحِ وفا ہوں
میں عارضِ گل نغمۂ بلبل میں بسا ہوں

ہے برق مرے خندۂ وحشی کی نشانی
ہے رعد مرے نالۂ غمگیں کی کہانی

میں سازِ فلک، سازِ زمیں، سازِ زماں ہوں
میں محرمِ جاں پردۂ در رازِ جہاں ہوں

ہر ذرہ مری آنکھ ہے کیا مجھ سے چھپو گے
چھپتے ہو عبث مجھ سے کہاں چھپ کے رہو گے

میں ربطِ عناصر ہوں میں شیرازۂ جاں ہوں
میں عشق ہوں، میں خونِ رگِ کون و مکاں ہوں

حامد علی خاں

مذہب

• انگلستان کے ایک ہندوستانی طالبِ علم“ نے گزشتہ اکتوبر کے ہمایوں میں مذہب پر من حیث المجموع چند اعتراضات کئے ہیں، اور مدیرِ ہمایوں نے اہلِ مذہب کو صلائے عام دی ہے کہ ان اعتراضات کا جواب دے کر [illegible] بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں۔ گو مضمون فی نفسہٖ ایسا نہیں ہے کہ اس کا رد کسی خاص دقتِ نظر کا محتاج ہو۔ لیکن چونکہ یہ اور اسی قسم کے اور خدشات اکثر انگریزی خواں طلبہ کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کا بالاستیعاب جواب دوں۔ یہ مضمون باوجود میری انتہائی کوشش کے خاصہ طویل ہو گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اعتراض تو ہمیشہ مختصر ہوتا ہے مگر اس کا شافی جواب ضرور مطول ہوگا۔

مضمونِ محولۂ بالا زیادہ تر بلا دلیل دعاوی پر مشتمل ہے۔ اور جس قدر نظریے پیش کئے گئے ہیں وہ سب کے سب خود محلِ نظر ہیں۔ اس لئے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بھی بنا والفاسد علی الفاسد کے مصداق ہیں۔ مثلاً صاحبِ مضمون فرماتے ہیں کہ مذہب زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے اور چونکہ انسان ذہنی ترقی کر کے جاہلیت کی چادر اتار کر پھینک چکا ہے اس لئے اسے مذہب کی ضرورت نہیں۔ اس نظریئے کا ثبوت پیش کئے بغیر وہ آگے بڑھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب مظاہرِ فطرت میں روحانی تصرف اور طاقت تسلیم کر لینے سے پیدا ہوا ہے۔ اس نظریے کو بطورِ حقیقتِ ثابتہ پیش کرنے کے بعد وہ تیسرا دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب کی تہ میں انسانی خوف و توہم کا جذبہ کارفرما ہے چنانچہ مذہبی رسوم و عبادات سب کی سب اسی جذبے کا مظاہرہ ہیں اور چونکہ سائنس نے توہمات کے قلعوں کو مسمار کر کے علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہے اور انسان مظاہرِ قدرت سے خائف ہونے کی بجائے ان سے کام لے رہا ہے اور روز بروز اس پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ تمام مظاہرِ فطرت کسی نہ کسی قاعدے اور قانون کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے مذہبی عقائد کی بنیاد متزلزل ہو گئی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مذہب ایک مرض ہے جو انسان کو زمانۂ جاہلیت میں لاحق ہو گیا تھا اور جب تک بنی نوعِ انسان نے اس موذی مرض سے نجات حاصل نہ کی اُن کی ترقی مسدود رہیگی۔ نیز انسان اوجِ کمال تک کبھی نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اِس روگ سے کاملاً نجات نہ پالے۔

اس کے بعد مذہب کے خلاف ایک اور محاذ قائم کرتے ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب نے ہمیشہ جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔ جابر بادشاہوں، ظالم حکومتوں، اور غریبوں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں کی پشت پناہی اس کا

خاصہ رہا ہے۔ اس لئے جس قدر جلد مذہب کو خارج البلد کر دیا جائے گا اسی قدر جلد مظلوم قومیں مزدور پیشہ جماعتیں اور غریب کسان جبر و استبداد کے آہنیں پنجہ سے نجات پائیں گے۔ مضمون کا بہ امعان نظر مطالعہ کرنے پر بھی ہمیں معترض صاحب کے دعووں کی کوئی دلیل اس میں نظر نہیں آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ان کی تحریر اور ان کے اعتراضات تیس چالیس سال پرانے ہیں۔ کیوں کہ انیسویں صدی کے آخر میں مذہب کی تحقیر و تضحیک سائینسدانوں کے ایک طبقے کے نزدیک فیشن میں داخل ہو گئی تھی اور کوئی سائینس دان ان کے نزدیک اہل علم کے زمرے میں شریک نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ مذہب پر سوفیانہ پھبتیاں کس کر اپنی حکمت و دانش اور حریت فکر کا ثبوت نہ دے۔ لیکن وہ سائنس کا روز اول تھا۔ اور جس طرح ایک بچہ اپنی تازہ علمی فتوحات پر فخر کرتا ہے اسی طرح اس زمانے کے سائنس دان سائنس کی چند ابتدائی فتوحات سے اپنا دماغی توازن کھو کر بڑیں ہانکنے لگے تھے کہ ہم نے مذہب کے حصار کو مسمار کر لیا ہے۔ لیکن جس قدر ترقی سائنس نے پچھلے تیس سال میں کی ہے اس کے سامنے انیسویں صدی کا سائینس طفل مکتب ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں سائنس ترقی کر رہا ہے اور سائنس دانوں کا علم اور تجربہ وسیع ہو رہا ہے ان کے طفلانہ دعاوی بھی معدوم ہو رہے ہیں اور اب کوئی قابل اعتنا سائنس دان مذہب کا ذکر حقارت سے کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا اور نہ مذہب کو زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہی قرار دے سکتا ہے بلکہ موجودہ زمانے کے ایک بہت بڑے سائنس دان کا مقولہ ہے کہ "دہریے کے لئے موجودہ سائنس کی مملکت میں کوئی جگہ نہیں ہے صرف بے وقوف یا مجنون ہی دہریہ ہو سکتا ہے۔" ہم دیکھتے ہیں کہ مل اور کانٹ کے زمانے میں جس وثوق سے قوانین قدرت پیش کئے جاتے تھے اور جس قدر حتمی طور پر ارنسٹ ہیکل اور ہیگل سائینس کو حقیقت ثابتہ (Positive Science) تسلیم کرتے تھے اسی قدر تامل سے موجودہ سائنس دان قوانین قدرت اور حقائق ثابتہ کا نام لیتے ہیں۔ کیوں کہ علم کی ترقی کے ساتھ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ ہم ابھی حقائق ثابتہ یا قوانین قدرت دریافت کرنے سے کوسوں دور ہیں۔

اسی طرح موجودہ زمانے میں کوئی صاحب علم یہ دعویٰ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ مذہب کی ابتدا یوں ہوئی تھی۔ بلکہ مختلف نظریئے جو جلد باز سائنس دانوں نے محض مذہب کی مخالفت کی بناء پر گھڑ لیئے تھے اب خود بخود متروک ہو رہے ہیں۔ اور محققین خود اس بات کے معترف ہو چکے ہیں کہ وہ نظریئے نہ تھے بلکہ قیاس آرائیاں تھیں۔ ان میں سے اکثر تو اس قدر پوچ ہیں کہ پہلی ہی نظر میں ان کی سخافت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور بعض پوچ تو نہیں مگر ان کے دلائل اس قدر ناقص اور نامکمل ہیں کہ انہیں حقائق ثابتہ کے طور پر پیش کرنا یا تو فریب نفس ہے یا بدترین سائینٹفک بددیانتی۔ قصہ مختصر اگر سائنس دانوں کی مختلف تھیوریوں کو جو انہوں نے مذہب کی ابتدا کے بارے میں اب تک پیش کی ہیں بنظر غائر دیکھا جائے تو ان پر مثنوی مولانا روم کی مشہور چھ اندھوں والی حکایت صادق آتی ہے جنہوں

نے ہاتھی کو کبھی نہ دیکھا تھا اور کسی نے ٹانگوں کو کسی نے سونڈ کو کسی نے دم کو مس کر کے ہاتھی کے متعلق مختلف نظریئے قائم کر لئے تھے۔ اسی طرح انیسویں صدی کے ان خود ساختہ محققین نے جو فی الحقیقت علم و بصیرت سے اسی قدر بے بہرہ تھے جیسے کہ وہ اندھے بصارت سے مذہب کی مختلف مسخ شدہ شکلوں کو دیکھ کر اسی پر اپنے نظریوں کی بنیاد استوار کرنی شروع کر دی۔ کسی نے کہا کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم (animiam) سے ہوئی۔ کسی نے کہا کہ مذہب اجداد پرستی یا ہیرو ورشپ سے پیدا ہوا ہے۔ کسی نے کہا کہ مظاہر فطرت کی لم نہ معلوم کر سکنے [illegible] انسان کے قلب پر ہیبت و خوف کے اثرات طاری ہوئے۔ اور اسے بادل کی گرج، بجلی کی چمک، آبشار کی فریاد، در[illegible] کی عظمت، سورج کی حدت غرض سب میں ایک ایک دیوتا کارفرما نظر آنے لگا۔ جسے اس کے سریع التاثیر دماغ نے قہر و غضب محبت و عداوت حسد و جوشِ انتقام وغیرہ انسانی صفات سے متصف کر دیا۔ اور ان مظاہرِ فطرت سے مستفید ہونے کے لئے اس نے ان دیوتاؤں کو خوش کرنا ضروری خیال کیا۔ اسی سے مذہب پیدا ہوا۔ لیکن جوں جوں علم و تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور نئے نئے تاریخی اکتشافات نے واقعات کا ایک انبار جمع کر دیا تو ان نظریوں کو واقعات پر منطبق کرنے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آنے لگیں اور تمام مذاہب پر ان نظریوں کا چسپاں کرنا مشکل معلوم ہونے لگا تو کسی نے اسے مرض، کسی نے اسے جہالت کا بقیہ اور کسی نے اسے ظلمت و وہم پرستی کا کرشمہ قرار دیا۔ لیکن یہ درحقیقت اپنے عجز و جہل کا اعتراف تھا۔ کیوں کہ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کی حقیقت کی تہ کو نہیں پا سکتا تو اس کی تحقیر و تذلیل سے اپنا دل خوش کر لیتا ہے۔

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

خود تاریخ کی روشنی میں بھی سائنس دانوں کے یہ نظریئے بالکل باطل ثابت ہو چکے ہیں۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم سے یا ہیرو ورشپ سے یا خوف و ہیبت کے جذبے سے ہوئی تو ظاہر ہے کہ دو باتیں لازماً ثابت ہونی چاہئیں۔

اول یہ کہ موجودہ مذاہب سے پہلے یعنی ان کی تعلیمات کے رائج ہونے سے قبل انسان پر کوئی زمانہ ایسا گزرا ہو جب کہ وہ صرف اینیمزم یا ہیرو ورشپ کرتا تھا اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مذہب نہ تھا اور نہ توحید سے اور نہ اعلیٰ اخلاق سے وہ واقف تھا۔

دوم۔ موجودہ مذاہب میں بھی ترقی اسی طریق پر ہوئی ہے کہ ان میں ابتداً اینیمزم یا ہیرو ورشپ موجود تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے توحید کے عقیدے تک پہنچے۔ یا بالفاظ دیگر مذہب کی ابتدا اس کی انتہا سے اسفل اور ادنیٰ تھی۔ ہم ایک مثال سے اس کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں آرین اور سامی مذاہب بہت قدیم خیال کئے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر مذہب اینیمزم یا ہیرو ورشپ سے پیدا ہوا تو لازماً ہمیں تاریخی طور پر ایسی شہادت

ملنی چاہئے کہ کوئی زمانہ ہندو یا سامی مذاہب پر ایسا گزرا ہے جب کہ توحید و الوہیت کا عقیدہ ان میں موجود نہ تھا لیکن تاریخ اس کی قطعی طور پر تردید کرتی ہے اور جس قدر ہمارا تاریخی علم وسیع ہو رہا ہے اسی قدر ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ہر مذہب کا ابتدائی عہد اس کا بہترین اور زرّین عہد تھا۔ پھر وہ پھلا اور پھولا اور اس نے رطب و یابس کو جذب کرنا شروع کیا۔ بالآخر اس میں فساد رونما ہو گیا اور توحید کی جگہ اصنام پرستی، ہیرو ورشپ اور مظاہر پرستی نے لینی شروع کر دی اور اعلیٰ اخلاق کی جگہ بداخلاقی عود کر آئی۔ چنانچہ عروج، اختلاط، تنزل و تسفل کی [illegible] سب مذاہب طے کر چکے ہیں۔ ہندو مذہب کو لو۔ اس کی ابتدا اعلیٰ توحید و یدانت اور تصوّف سے ہوئی۔ انسانی مساوات اور اخوت کی تعلیم کے دوش بدوش دنیا اور دنیا والوں کی مذمت کے جذبات اس کی مذہبی کتب میں موجود ہیں۔ لیکن مرورِ ایّام سے اس میں بدترین شرک مثلاً اصنام پرستی، حیوان پرستی، اشجار پرستی، لنگ پرستی وغیرہ وغیرہ داخل ہو گئے اور ہمارے پاس اس امر کے ناقابلِ تردید دلائل موجود ہیں کہ برہمنوں نے اپنے مذہبی اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے لوگوں کو وید، گیتا اور اپنشدوں کی تعلیمات سے چھڑا کر شرک و اوہام پرستی میں مبتلا کر دیا۔ گویا ہندو مذہب میں انیمزم اور ہیرو ورشپ، توحید اور ہمہ اوست کے عقائد کے بعد کی ملحقات ہیں اور اب بھی ہم ہندو مذہب میں توحید کے دوش بدوش بدترین شرک کو موجود پاتے ہیں۔ اسی طرح اخوت و مساوات کی جگہ ذات پات اور چھوت چھات نے ہندو مذہب میں گھر کر لیا اور اسے رفتہ رفتہ قعرِ مذلت میں پہنچا دیا۔ اسی طرح بدھ مذہب کی ابتدا کیسے زرّیں اصولوں سے ہوئی اور بدھ نے دنیا کے سامنے کیسی اعلیٰ تعلیم توحید و اخلاق کی پیش کی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کیوں کر وہ مذہب پھیلا۔ بڑھا اور پھر تنزل کی طرف جا کر بدترین صنم پرستی میں تبدیل ہو گیا چنانچہ بدھ (بت) کا لفظ فارسی زبان میں صنم کا مترادف ہو گیا۔ اسی طرح کا تنزل ہم یونانی رومی اور ایرانی مذاہب میں بھی پاتے ہیں۔ عیسائیت کی ابتدا بھی حضرت مسیح علیہ السّلام کی پاکیزہ تعلیمات سے ہوئی جو توحید و اخوت سے معمور ہیں لیکن رفتہ رفتہ توحید کی جگہ تثلیث، مریم و عیسیٰ پرستی اور عملِ صالح کی جگہ کفارے نے لے لی۔ خود اسلام کو لو جو مذہب کی سب سے آخری اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے۔ کیوں کر اس کی ابتدا اعلیٰ توحید اور بہترین اخلاقی تعلیمات سے ہوئی اور کیوں کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان سچے موحد، اخلاقِ فاضلہ اور اخوت و مساوات کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اور موجودہ زمانے میں کیوں کر قبر پرستی، پیر پرستی، تقلیدِ جامد نے توحید کو جلاوطن کر دیا ہے اور ذات پات اور قومیّت نے اخوت و مساوات کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مذہب مظاہر پرستی یا ہیرو ورشپ کی ترقی یافتہ صورت ہے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا ورنہ ہم آج یہ نظارہ نہ دیکھتے کہ ہندو مذہب میں ویدانت اور تصوّف کے پہلو بہ پہلو بدترین شرک موجود ہے۔ عیسائیوں میں موحدین کے پہلو بہ پہلو الوہیتِ مسیح اور اقانیم ثلٰثہ کے عقائد کو ماننے والوں کی ایک موقر اور زبردست جماعت موجود ہے اور خود اسلام میں اس قدر اصلاحی تحریکات کے

شروع ہونے کے باوجود، اعلیٰ ترین اور خالص توحید کے دوش بدوش بدترین مظاہر شرک مثلاً قبر پرستی وغیرہ موجود ہیں اس لئے تاریخی طور پر اس حقیقت سے انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ مذہب نے اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کے بجائے ہمیشہ اعلیٰ سے اسفل کی طرف تنزل کیا ہے اور اس کی ابتدائی حالت ہمیشہ خالص و بے عیب رہی ہے اسکی ابتدائی تعلیمات شرک و اوہام پرستی سے پاک اور ابتدائی پیرو اعلیٰ اخلاق انسانی سے متصف اور کمال انسانی کے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں اور اب بھی جب کہ بقول حضرت معترض کے سائنس کی روشنی نے لوگوں کی آنکھ کی پٹی اتار دی ہے ہم یورپ و امریکہ میں وہی وہم پرستی، وہی تثلیث، وہی مریم و مسیح پرستی موجود پا[illegible] یہ دعویٰ کرنا کہ مذہب کی ابتدا مظاہر پرستی یا اجداد پرستی یا خوف و ہیبت سے ہوئی واقعات سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ کہنا ایسا ہی لغو ہوگا جیسا یہ دعویٰ کرنا کہ ہندو مذہب کی ابتدا اصنام پرستی، عیسائیت کی ابتدا مسیح و مریم پرستی۔ یا اسلام کی ابتدا قبر پرستی اور اینیمزم سے ہوئی۔ اور اگر ہم خداداد عقل و دانش سے کام لیں اور استقرار کا خون نہ کریں تو واقعات کا مطالعہ ہمیں ایسے نتیجے پر پہنچائے گا جو سائنس دانوں کے مفروضہ نظریوں کے بالکل متضاد ہوگا۔

فی الحقیقت مذہب کے متعلق جس قدر بھی نظریئے سائنس دانوں نے پیش کئے ہیں ان کی تہ میں فقط ایک جذبہ کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ مذہب کے الہامی ہونے سے انکار کیا جائے۔ ہم انشاء اللہ اس مضمون میں اس پر اجمالی روشنی ڈالیں گے کہ بغیر مذہب کے الہامی تسلیم کئے ہم کسی طرح مذہب کی حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ یہاں ہم ایک اور مغالطہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس میں مذہب کے مخالفین مبتلا ہیں اور وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی ابتدا حقیر ثابت کر دینا ہی اس کی تکذیب و تردید کے لئے کافی ہے۔ اس لئے بخیال خود جب وہ یہ ثابت کر چکتے ہیں کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم سے یا اجداد پرستی سے یا خوف و ہیبت کے جذبات سے ہوئی تو وہ فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ مذہب بالکل ناکارہ اور بے کار ہے اور پھر خود ہی فاتحانہ انداز میں چلا اٹھتے ہیں کہ اب مذہب کی کوئی پشت پناہ نہیں رہی اور ہم نے اس کی لغویت پر مہر تصدیق ثابت کر دی ہے حالانکہ عقل سلیم کے نزدیک ان کا یہ استدلال ایسا ہی لغو ہے جیسا یہ کہ چونکہ انسان ایک حقیر قطرے کے دس لاکھویں حصہ سے پیدا ہوا ہے اور درخت کا بیج پھولوں کا پولن وغیرہ سب کے سب اس سے زیادہ موقر ہیں اس لئے انسان اسفل المخلوقات ہے۔ اسی طرح اگر ہم یہ ثابت کریں کہ سائنس کی ابتدا جادو، ٹونوں اور ٹوٹکوں سے ہوئی تو اس سے سائنس کی حقارت اور ناکارہ پن ثابت ہو جائے گا۔ ایسے نتائج اخذ کرنا یقیناً انسانی عقل و فراست کی توہین ہے۔ اسی طرح محض یہ ثابت کر کے کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم یا اجداد پرستی سے ہوئی یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ مذہب بالکل عبث اور بیکار ہے انسانی علم و تجربہ اور فہم و فراست کی توہین ہے

اصل بات یہ ہے کہ مذہب کی مخالفت کا جذبہ انیسویں صدی کے سائنس دانوں کے ایک طبقے میں اس

قدر ترقی کر گیا تھا کہ اس نے انہیں بالکل اندھا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے مذہب کی مخالفت میں پوچ سے پوچ نظریئے پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے سائنس دان ارنسٹ ہیکل نے جو مذہب کے شدید ترین مخالف تھے مذہب کی مخالفت میں دروغ بافی تک سے دریغ نہ کیا۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان ٹامسن اپنی ایک تازہ کتاب مذہب و سائنس Religion and Science میں لکھتے ہیں ... حرکت پر حق پسند سائنس دانوں کی گردنیں ندامت سے جھک جاتی ہیں کیوں کہ ہیکل نے ایسی بات کا ... کا الزام وہ ازمنۂ وسطی کے پادریوں کو دیا کرتا تھا" پس میں اپنے نوآموز جدید تعلیم یافتہ احباب سے بہ ادب عرض کروں گا کہ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ان سائنس دانوں کی مجذوبانہ بڑوں کو حقائق ثابتہ یقین کرنے سے پہلے خود بھی خدا داد عقل و بصیرت سے کام لیں۔ ورنہ وہ سراب کو پانی سمجھ کر اس کے پیچھے پڑیں گے اور پیاس سے ہلاک ہو جائیں گے۔ عارفِ رومی نے کیا خوب کہا ہے:۔

ہر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود   زانکہ برجندل گماں بردند عود

جہاں تک ہمارا علمِ تاریخ ہماری رہنمائی کرتا ہے اور اس میں میں آثارِ قدیمہ کے جدید ترین انکشافات کو شامل کرتا ہوں ہمیں انسان کا کوئی دور ایسا نہیں ملتا جس میں انسان نے بغیر مذہب کے زندگی بسر کی ہو۔ اور نہ آج ہی باوجود سائنس کی اس قدر ترقی کے ہم مذہب کی گرفت کو کمزور ہوتا دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور پوری قوت سے موجود ہے اور سائنس کی ترقی، بالشویکوں کے بے پناہ مظالم، دہریوں کا گمراہ کن پروپیگنڈا اس کے اثر و نفوذ کو اکھاڑ نہیں سکا۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آئندہ بنی نوعِ انسان بغیر مذہب کے زندگی بسر کریں گے ایسا ہی منطقیانہ نتیجہ ہو گا جیسا کہ انسان کسی آنے والے زمانے میں بغیر قلب و جگر کے زندہ رہ سکے گا، یا بغیر پھیپھڑوں کے سانس لے سکے گا، یا بغیر ہوا کے اپنی زندگی بسر کر سکے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بالطبع مدنی ہے۔ اور مدنیت بغیر تعلقات کے قائم نہیں ہو سکتی اور تعلقات بغیر معاشرتی اور اخلاقی قوانین کے استوار نہیں ہو سکتے۔ انسان اور حیوان میں یہی مابہ الامتیاز ہے کہ حیوان اپنے افعال میں صرف اپنی فوری ضروریات اور ان کے ازار اور اس کے فوری نتائج پر غور کرتا ہے لیکن انسان مجبور ہے کہ اپنی نظر کو یہیں تک محدود نہ رہنے دے۔ مثلاً ایک شہد کی مکھی گرمیوں میں مختلف پھولوں سے شہد اکٹھا کرتی ہے اور اپنے چھتے میں جمع کرتی ہے تاکہ اسے موسم سرما میں کھا سکے۔ اب وہ تمام پھولوں پر جو اس کی دسترس میں ہوں گے بیٹھے گی اور میٹھا رس چوس چوس کر اپنے چھتے میں لائے گی۔ اس کے پیشِ نظر اپنی اور اپنے بچوں کی غذا کی فراہمی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک او بلاؤ جب اپنا گھر بناتا ہے تو اسے اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کا خیال ہوتا ہے اور بس۔ لیکن ایک انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو وہ مجبور ہے کہ اپنی فوری ضروریات کے ازار اور اس کے فوری

نتائج کے علاوہ اور باتوں پر بھی غور کرے۔ مثلاً انسان کو اپنی بھوک کے لئے اناج اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے وہ کھیتی بوئے گا، باغ لگائے گا مگر اس میں بھی اسے سب سے پہلے یہ خیال کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے ہمسایہ کی زمین میں کھیتی نہ بوئے یا باغ نہ لگائے کیوں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے ہمسایہ کو خوراک کے حصول کے ذرائع سے محروم کر رہا ہے اور یہ چیز مدنیت کے منافی ہے۔ اسی طرح جب وہ کھیتی بوئے گا تو اسے اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ ایسی چیز بوئے جس کی زمین متحمل ہوسکتی ہے اور موسم اس کے موافق ہے۔ مثلاً برسات کے موسم میں وہ چا[illegible] کرے گا کیوں کہ انہیں پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ اس بات کا بھی خیال رکھے گا کہ زمین [illegible] کرے کہ اس کی طاقت زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم و برقرار رہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اسے بیج ڈالنے کے لئے اپنے ہمسائے کا غلّہ نہیں چرانا چاہئے ورنہ وہ ہمسایہ شاید اس کا غلّہ چرا لے جائے گا۔ اور اس طرح سوسائٹی میں عملِ تخریب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہیں پر بس نہیں جب اس کے پاس غلّہ جمع ہوتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہے تو وہ اپنی ضروریات کو کم کرکے ہمسایہ کی مدد کرنے کا خیال کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان خیالات کے پیدا ہوتے ہی اسے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ علم طبعی اس کی اس بات میں تو رہنمائی کر سکتا ہے کہ وہ اپنی کھیتی کو کیوں کر کاشت کرے کہ اس کی زمین کی قوّت زائل نہ ہو یا کم سے کم محنت میں زیادہ سے زیادہ ثمرات پیدا ہوں یا کس موسم میں کس قسم کا بیج ڈالنا چاہئے لیکن یہ اُس کی اِس بارے میں ہرگز رہنمائی نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے ہمسائے کی حق تلفی نہ کرے یا اپنی ضروریات کو کم کرکے اپنے بھائی کی ضرورت میں اس کے کام آئے۔ اسی طرح بقائے نسل کا مسئلہ لو۔ حیوانات میں توالد و تناسل کا سلسلہ بغیر کسی خاص پابندی یا ذمہ داری کے جاری و ساری ہے لیکن انسان اس طرح اپنا سلسلۂ توالد و تناسل جاری نہیں رکھ سکتا۔ کیوں کہ سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ حیوانات کے بچے اپنی تربیت کے لئے محض وجدان کے محتاج ہیں اور بس۔ لیکن انسان کا بچہ خاص طور پر تعلیم و تربیت کا محتاج ہے اور بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے والدین پر اس کی تعلیم و تربیت کی گرانبار ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ والدین کے تعلقات زناشوئی میں کوئی دوسرا خلل انداز نہ ہو۔ اسی طرح انسان اپنے زناشوئی تعلقات سے محض توالد و تناسل کا کام ہی نہیں لیتا بلکہ اس سے رفاقت اور دوستی یا اپنے مدنی جذبہ کی تسلّی و تشفّی کی بہترین صورت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ امر مسلّم ہے کہ سوسائٹی کی ابتدا کنبہ اور خاندان سے ہوئی ہے۔ اس لئے اور بھی ضروری ہوا کہ کوئی دوسرا شخص میاں بیوی کے تعلقات میں رخنہ انداز نہ ہو ورنہ سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ہر شخص موقع ملنے پر دوسرے کے تعلقات میں رخنہ اندازی کی کوشش کرے گا۔ سائنس اس مسئلہ میں انسان کی رہنمائی کرنے میں یہاں تک عاجز و درماندہ ہے کہ وہ زنا اور مناکحانہ تعلقات میں کوئی فرق نہیں بتلا سکتا۔ اسی طرح صداقت و دروغ گوئی، ایثار و خودغرضی

عفت و حرامکاری، عصمت و بدکاری، شجاعت و تہوّر، حب وطنی و عصبیت، غرض اعلیٰ اور ادنیٰ خلق میں سائنس کسی قسم کی حد فاصل قائم کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات روزانہ انسان کے سامنے آتے ہیں اور انسان ان کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہے اس کا ظاہری علم اور تجربہ اس کا سائنس اور اس کی تحقیقات ان امور میں اس کی یاوری نہیں کر سکتے۔ اور اگر مذہب اس کی تائید و رہنمائی کو نہ آتا تو انسان بالکل بے یار و مددگار رہ [illegible] سوسائٹی بالکل فنا ہو جاتی۔ مذہب ہی نے تاریکی میں انسان کو نور ہدایت کی روشنی دکھائی ہے [illegible]ی کی دلدل سے نکال کر اخلاق فاضلہ سے اس کے قلب کو منور کیا ہے۔ اس لئے انسان مذہب کی رہنمائی سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکا اور نہ آئندہ ہی کبھی ہو سکے گا۔

اب رہا یہ دعویٰ کہ مذہب نے ہمیشہ جبر و استبداد کی حمایت کی ہے، سو یہ بھی مدعی کی تاریخی لاعلمی کا نتیجہ ہے کیونکہ جہاں تک میرا علم میری رہنمائی کرتا ہے میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سچے مذہب سے زیادہ کسی نے بھی مظلوم کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت اور جابر و ظالم بادشاہوں سے بغاوت نہیں کی۔ کیا کرشن جی کا پانڈوؤں کی تائید میں صف آرا ہونا اور گیتا سنا کر ارجن کو کوروں پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور کرنا، مظلوموں کی حمایت کے لئے نہ تھا۔ کیا گوتم بدھ کی تعلیمات رہبانیت اور ترکِ دنیا سرمایہ داری کے خلاف بے پناہ جہاد نہ تھا۔ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فراعنۂ مصر سے نجات نہیں دلائی۔ کیا زرتشت نے حکومتِ وقت کے خلاف نفرت و حقارت پھیلا کر اس کی برائیوں کی اصلاح نہیں کی۔ کیا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا دولت اور دولت مندوں کے خلاف وعظ کرنا سرمایہ داری اور ظلم کے خلاف بہترین جہاد نہ تھا۔ اور کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس الزام کا لگایا جانا کہ وہ حکومتِ وقت کے باغی ہیں اس لئے پھانسی کے مستوجب اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس وقت کے جبابرہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو باغیانہ تعلیم باور کرتے تھے۔ اور دل سے اس بات کے قائل تھے کہ ان کی تعلیم ایک نہ ایک دن ان کی ظالمانہ حکومتوں کا تختہ اُلٹ دے گی۔ پھر کیا پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے سب سے پہلا کام یہ نہیں کیا کہ عربوں کو قیاصرہ اور اکاسرہ کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں تمام دنیا کی آزادی کا پیام دینے پر مامور فرمایا۔ کیا اسلام کی اخوت و مساوات کی عملی تعلیم جبابرہ اور سرمایہ داری کی حمایت کے لئے تھی۔ کیا سود کی مخالفت اور حرمت اور وراثت اور خیرات کی فرضیّت سرمایہ داری اور ظلم کی تائید کے لئے تھی یا انہیں جڑ سے اکھاڑ دینے کے لئے۔ پھر کیا دنیا کے ان تمام بڑے بڑے انبیاء نے بنی نوعِ انسان کی حریتِ فکر جسمانی آزادی اور اخلاقی برتری کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ سب کی سب جبر اور ظلم کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے تھیں۔ اور دور کیوں جاتے ہو دنیا کی تازہ ترین تحریکِ آزادی کا غور سے مطالعہ کرو جس کی طرف اس وقت تمام دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں یعنی ہندوستان کی ستیہ گرہ۔ کیا اس کا رہنما اس وقت دنیا میں مذہبی انسان کہلاتا ہے یا سائنس دان۔ کیا تمام دنیا اسے مادّیت اور روحانیت، مغربی تہذیب

اور مذہب کی جنگ سے تعبیر نہیں کر رہی۔ کیا یہ تحریک جسے ایک مذہبی آدمی نے جاری کیا ہے اور خالص مذہبی حدود کے اندر رہ کر جاری ہے مظلوم کی حمایت کے لئے نہیں ہے۔ خدارا غور کرو اور نظر انصاف سے حقائق کو دیکھو کہ مذہب نے دنیا کو اخوت و مساوات، ہمدردی و غمگساری، آزادی اور حریت کا سبق دیا ہے یا سائنس نے۔ سائنس نے کس قوم کو آزادی بخشی، کسی مظلوم کی حمایت میں سینہ سپر ہوا، کس جماعت کو درسِ آزادی و حریت دیا۔ ممکن ہے کہ سائنس کے حامی انقلابِ فرانس و امریکہ کو پیش کریں کہ یہ سائنٹیفک سپر[illegible] لیکن یہ غلط ہے۔ بلکہ ان کے تحت میں بھی مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ فرانس کی پہلی ان[illegible] نے منکرین خدا کے لئے گلوٹین کی سزا تجویز کی تھی۔ ہاں موجودہ زمانے میں بولشویک انقلاب ایک ایسا انقلاب ہے جو بظاہر مذہب کی مخالفت سے معمور ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بولشوزم زیادہ دیر تک مذہب کے خلاف نہیں رہ سکتی اور اگرچہ اس کی مثال ایک تجربے کی ہے لیکن قرائن و آثار چاہتے ہیں کہ بولشویکوں کو اگر زندہ رہنا ہے تو انہیں مذہب کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑے گا۔

یہ بے شک صحیح ہے کہ مذہب کے انحطاط کے زمانے میں اس کے بعض رہنماؤں نے حکومتِ وقت کا ساتھ دیا ہے اور ہر ممکن ذریعے سے جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ مذہب کا داعیہ اور مقتضا یہ تھا کہ جبر و استبداد کی تائید کی جائے بلکہ ان رہنماؤں کی خودغرضانہ فریب کاریوں کا سلسلہ حکومت وقت کی تائید کے بغیر جاری نہ رہ سکتا تھا۔

لیکن جو کام مذہب نے اپنے دورِ انحطاط میں سرانجام دیا وہ سائنس اپنے عروج کے زمانے میں دے رہا ہے۔ اور مذہب سے بھی زیادہ جابر حکومتوں اور سرمایہ داروں کا مؤید ثابت ہو رہا ہے۔ کیا تمام آلاتِ حرب و ظلم و ستم کے تمام حربے سائنس کی ایجاد نہیں۔ کیا جس قدر ہتھیار سرمایہ دار اور اربابِ حکومت مزدوروں اور کسانوں کے کچلنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں وہ سائنس کے عطا کردہ نہیں ہیں۔ کیا ڈائنامیٹ کی ایجاد انسان کے لئے رحمت ثابت ہوئی یا بے پناہ مصیبتوں کا سیلاب اپنے ساتھ لائی۔ کیا ہوائی جہاز، بحری جنگی جہاز، تارپیڈو کشتیاں توپیں، بندوقیں، کارتوس وغیرہ جن کی مدد سے حکومتیں انتہائی مظالم کر رہی ہیں۔ ان سب کی ایجاد کا سہرا سائنس کے سر پر نہیں۔ کیا زہریلی گیس، دمدم گولیاں، آتشبار ٹینک، مسلح موٹریں اور دیگر آلاتِ ہلاکت بنی نوع انسان کے لئے بالعموم اور مزدور پیشہ جماعتوں اور غریب کسانوں کے لئے بالخصوص آیۂ رحمت ثابت ہو رہے ہیں یا ظلم کی انتہائی صورت، یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کو نافذ کر کے غالب کے مغلوب کو کچلنے کے حق کو بزور ثابت کر رہے ہیں۔ تو پھر کیا ان تمام ایجادوں کی بدولت جو کشت و خون ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اور آئندہ ہونے والا ہے۔ جو ظلم و ستم مزدوروں اور کسانوں پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے جس بُری طرح مظلوم کچلے جا رہے ہیں اور

قوموں کی قوموں کو خداداد آزادی سے محروم کرکے غلام بنایا جارہا ہے ان سب کی ذمہ داری سے سائنس سبکدوش ہوسکتا ہے۔ نہیں اور یقیناً نہیں تو اگر ان سب کی ذمہ داری سائنس کے کندھوں پر ہے تو کیا یہی بات اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ سائنس بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیا اسی برتے پر سائنسدان کہتے ہیں کہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ خود سائنس کے مضرات اور مہلکات سے بنی نوع انسان [illegible] مذہب کی ضرورت ہے تاکہ علم کو محبت اور خدمتِ خلق کو بھولا ہوا زریں سبق سکھا کر اسے بجائے ظلم [illegible] آلۂ کار بنادے اور دنیا کو نئے سرے سے خذ ماصفا ودع ماکدر کا فراموش شدہ زریں اصول یاد دلادے +

میرا اس تحریر سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں سائنس کے مفاد سے انکار کروں۔ یہ جسارت تو کم علم سائنسدان ہی کرسکتے ہیں جو سرے سے مذہب کے افادات سے انکار کرکے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ میرا مقصد انسانی علم کی خامیاں ظاہر کرکے محض یہ دکھانا ہے کہ انسان لاکھ کوشش کرے کہ اپنے علم کے مضرات سے بچ جائے اور صرف مفاد ہی مفاد حاصل کرے لیکن یہ ناممکن ہے۔ درحقیقت اس کا اپنا علم اس پر الف لیلہ کے مشہور پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہوجاتا ہے اور باوجود ہر ممکن کوشش کے وہ اس کی آہنی گرفت سے آزاد نہیں ہوسکتا +

اب ہم ایک اور مشہور مغالطہ کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر سائنس دان نظریۂ ارتقاء کو مذہب پر منطبق کرنے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے تمام شعبہ ہائے علم کی مانند مذہب بھی ارتقائے انسانی کا جزوِ لاینفک ہے اور ارتقا کا ہمہ گیر اصول جس طرح جمادات نباتات اور حیوانات میں کارفرما ہے اسی طرح انسان کے تمام علوم ہیئت وطبیعیات، کیمیا، بیالوجی، فلسفہ، سوشیالوجی، معاشیات اقتصادیات اور مذہب و اخلاق میں بھی کارفرما ہے۔ اگر معاملہ یہیں پر ختم ہوجاتا تو ہم اس کو معرضِ بحث میں نہ لاتے لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض شتاب کار سائنس دان مذہب کے متعلق نظریۂ ارتقار سے جھٹ ایک ہی جست میں اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ مذہب زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے اور بانیانِ مذہب نے بنی نوعِ انسان پر کوئی خاص احسان نہیں کیا بلکہ محض توہمات کو بنی نوع انسان میں مستقل طور پر رواج دے دیا۔ اس لئے فی زمانا ہمیں مذہب کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ نتیجہ سرتاسر غلط ہے +

مسئلۂ ارتقار کی خامیوں پر بحث کرنے سے ہم نفسِ مضمون سے بہت دور جا پڑیں گے۔ نہ ہمارا مختصر مضمون اس مسئلہ پر کسی سیر حاصل بحث کا متحمل ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہم فی الحال اس بات کو تسلیم کرلیتے ہیں کہ انسان کے دوسرے علمی شعبوں کی مانند مذہب بھی بتدریج ارتقائی منازل طے کرکے اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل یعنی اسلام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن اس نظریئے کے تسلیم کرلینے سے ان بانیانِ مذہب کا احسان جنہوں نے بتائیدِ ایزدی

اس ترقی میں حصہ لیا اور اس قصرِ اخلاق کی تعمیر میں جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے ممد و معاون ہوئے بنی نوع انسان پر کیوں کر کم ہوسکتا ہے جب کہ خود علومِ طبعی میں سے نظریۂ ارتقا کو تسلیم کر لینے سے سائنس اور فلسفہ بطلیموس، اقلیدس، فیثاغورث، افلاطون، ارسطو، بوعلی سینا، فارابی۔ ابن رشد، گلیلیو، کوپرنیکس، نیوٹن، ہرشل، آئن سٹائن وغیرہم کے احسان سے کسی طرح بھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ یہ ممکن ہے کہ نظامِ بطلیموسی کی طرح ارسطو کا فلسفہ تقویمِ پارینہ ہوجائے یا حکیم آئن سٹائن کے نظریئے کی ہمہ گیری، نیوٹن کے نظریوں کو داستانِ کہنہ اور[illegible] یا خود حکیم آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت متروک ہوجائے لیکن بطلیموس ارسطو یا نیوٹن یا آئن سٹائن [illegible] ویسے ہی محبوب رہیں گے اور ان کا نام ویسے ہی عزت و احترام سے لیا جائے گا جیسا کہ کسی بڑے سے بڑے زندہ سائنس دان کا۔ لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا ابھی تک جینیس (Genius) یعنی فطین کی پیدائش کی کوئی سائنٹیفک توجیہ پیش نہیں کرسکا اور باوجود اپنی ہمہ گیری کے بطلیموس سے لے کر آئن سٹائن تک جس قدر (Genius) جینیس پیدا ہوئے ہیں ان کا وجود اس کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہو رہا ہے اور زبردست سے زبردست حامیٔ مسئلۂ ارتقاء کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان حکما کا وجود نظریۂ ارتقاء کے فریم (چوکھٹے) میں چسپاں نہیں ہوسکتا۔ جب طبعی دنیا میں جو سائنس کی جولانگاہ ہے سائنس کی درماندگی کا یہ حال ہے تو بھلا روحانی دنیا میں جو سرے سے اس کی دسترس سے ہی باہر ہے وہ کیوں کر بانیانِ مذہب و اخلاق اور رہنمایانِ معاشرت و سیاست کے وجود کی تشفی بخش توجیہ پیش کرسکتا ہے اس لئے کنفیوشس، سقراط، سولن، زرتشت، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندرجی، کرشن مہاراج، گوتم بدھ اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے وجود اور ان کے کارنامے ارتقائی سائنس دانوں کے لئے ہمیشہ عقدۂ لاینحل رہے ہیں۔ اور وہ باوجود انتہائی کدوکاوش کے کوئی سائنٹیفک توجیہ جس سے یہ اربابِ علم و بینش ارتقا کے جامے میں سما سکیں پیش نہیں کرسکے۔ اسی چیز کو جس کی توجیہ سے ارتقا قاصر ہے مذہب فضلِ ربّی سے تعبیر کرتا ہے جو دنیاوی علوم میں الہام کی صورت میں اور روحانی علوم میں بھی الہام و وحی کی صورت میں انسانی ہدایت کے لئے ظاہر ہوتا ہے۔ اور انسان کو ہر قدم پر یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے کہ علم کا حقیقی سرچشمہ الہامِ ربانی یا فیضانِ الٰہی ہے اور بس۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

(اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا)

اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تمام علمی ترقی اسی ایک آیت کی تفسیر ہے۔ مادّی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو مقلدین کا ہے جو لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ باوجود نئی ضروریات کے احساس کے ان کے ازالہ کے لئے کوئی تبدیلی اپنے معمولِ زندگی میں نہیں کرسکتے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو مقابلۃً

زیادہ چست اور ہوشیار ہوتے ہیں وہ انسانی علم کے سرمائے سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسی پر اپنی تفریعات کی بنیاد قائم کرتے ہیں لیکن وہ بھی علم کی تخلیق میں حصہ نہیں لیتے۔تیسرا طبقہ ان حکما کا ہے جو اللہ کی تائید سے انسانی ضروریات کو دیکھتے ہیں اور ان کے ازالہ کے لئے نئی دریافت یا ایجاد کرتے ہیں وہ اپنی (Originality) یا اپج سے انسانی علم میں اضافہ کرتے ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ روشن کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر [illegible] پیش کرتے ہیں۔حکیم ارشمیدس سے پہلے بھی دنیا پانی میں غسل کرتی تھی اور تیرتی تھی لیکن حکیم ارشمیدس [illegible] سے مسئلۂ وزنِ مخصوص دریافت کیا اور اس کو نہاتے نہاتے ایسا محسوس ہوا گویا کہ یک لخت اس کا سینہ منور ہو گیا ہے چنانچہ وہ اس کی خوشی میں اپنے غسل خانے سے ننگا دوڑا۔اسی طرح نیوٹن کا قصہ لو نیوٹن سے پہلے ہزارہا حکما نے سیب کو درخت سے گرتے دیکھا تھا لیکن قسّامِ ازل نے یہ شرف نیوٹن کے لئے مخصوص کر کر رکھا تھا کہ اس کے سینے پر سیب کو گرتے دیکھ کر یک لخت نظریۂ کششِ ثقل منعکس ہو جائے۔ایک اور چیز جو یہاں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے جینیئس (Geniuses) میں اکثر ایسے تھے جو کتابی علوم میں بہت زیادہ دستگاہ نہ رکھتے تھے۔چنانچہ نیوٹن اور ڈاروِن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کیمبرج میں بی اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم میں حقیقی اضافہ سوائے القائے ربّانی کے ناممکن ہے اور ہر ترقی میں ہم موہبتِ ربّانی کو کارفرما دیکھتے ہیں۔اسی طرح روحانی دنیا میں بھی انسانوں کی تین قسمیں ہیں۔مقلدین علما اور انبیا۔انبیا روحانی دنیا کے (Geniuses) جینیئس ہیں۔جو براہِ راست انوارِ الٰہی سے مستنیر ہو کر اور وحیٔ الٰہی سے فیض حاصل کر کے دنیا کو مشعلِ ہدایت دکھاتے ہیں۔گویا فیضانِ الٰہی جس طرح مادّی دنیا میں کارفرما ہے اسی طرح روحانی دنیا میں بھی اپنے ابرِ کرم سے تشنہ کاموں کو ہر لحظہ اور ہر آن سیراب کر رہا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا زمانہ علمی ترقی کا آ بھی جائے کہ سائنسدان ارسطو، بوعلی سینا، نیوٹن، آئن سٹائن وغیرہم کی رہنمائی کی طبعی دنیا میں اور حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے روحانی دنیا میں ظاہر ہونے اور بنی نوعِ انسان کو مشعلِ ہدایت دکھانے کی کوئی صحیح ارتقائی توجیہہ پیش کریں تو بھی جس طرح سائنس اور بنی نوع انسان باوجود یہ تسلیم کر لینے کے کہ ارسطو، بوعلی سینا، نیوٹن اور آئن سٹائن وغیرہم ارتقائے انسانی کا لازمی ثمرہ ہیں ان کے عظیم الشان احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور ان کے کارناموں کی تخفیف کر کے اپنی حماقت اور ناشکرگزاری کی نمائش نہیں کر سکتے۔اسی طرح بنی نوع انسان مذہب و اخلاق کے ان پیغمبروں کے عدیم النظیر اور غیر فانی احسانات کے بارِ گراں سے کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔اس لئے کوئی صاحب عقل و خرد ایسا کہنے کی جرأت اور کوئی اہلِ علم و بصیرت ایسا دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ روحانیت اور اخلاق کے ان ہادیانِ برحق کے کارنامے یعنی مذہب جہالت کا بقیہ ہے کیوں کہ ایسا کہنا خود نوع انسان کی انتہائی

توہین و تذلیل ہے۔

ہم اس پر ایک اور نقطۂ نظر سے بھی غور کر سکتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی علمی تعمیر فی الجملہ ایک ایسا محل ہے جس کے معمار اور انجنیر وقتاً فوقتاً پیدا ہو کر اس کی تکمیل میں حصہ لیتے رہے ہیں اور اس محل کی تعمیر میں حروفِ تہجی یا عربی اعداد کے موجد کا بھی اتنا ہی بڑا حصہ ہے جتنا کہ چھاپے خانے یا سٹیم انجن کے موجد یا ارسطو یا آئن سٹائن کا۔ اسی طرح سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان نے ایک اور اس سے بھی زیادہ روشن اور عظیم الشان قصر اخلاق و معاشرت تعمیر کیا ہے جو انسان کو حیوانات سے متمیز کر رہا ہے اور اس تمام اخلاقی اور معاشرتی نظام کی تعمیر کے بغیر وہ کبھی بھی انسان کہلانے کا مستحق نہ ہو سکتا تھا۔ تاریخی طور پر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام اخلاقی اور معاشرتی نظام انسانی قانون اور انسانی تہذیب و تمدن تمام کے تمام انبیاء کی تعلیم پر قائم ہیں۔ اور جب تک دنیا میں کسی قسم کا اخلاقی اور معاشرتی نظام قائم رہے گا کنفیوشس کا نام چین میں، زرتشت کا نام ایران میں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام مصر اور شام میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام عیسائی دنیا میں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تمام دنیا میں عزت اور احترام سے لیا جائے گا۔ کیوں کہ ان ہادیانِ برحق نے انسان کے اس قصر کی تعمیر کی۔ اس لئے اگر ہم یہ مان لیں کہ مذہب جہالت کا بقیہ اور توہم پرستی کا کرشمہ ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان کا تمام اخلاقی اور معاشرتی نظام، انسان کا قانون اور انسانی تہذیب و تمدن جہالت کا بقیہ اور توہم پرستی کے کرشمے ہیں کیا کوئی شخص اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ انسان کے اس عظیم الشان قصرِ اخلاق کو منہدم اور انسانی شرف و عزت کو کالعدم کر کے انسان کو دوبارہ حیوانات کے زمرے میں لا کھڑا کرے۔

ممکن ہے کہ بقول گوئٹے کے "موجودہ زمانے میں شیطانی جذبات کے ہیجان اور ابلیسی خواہشات کے تلاطم میں بہنے والے، ہوا و ہوس کے اسیر، خود غرضی اور خود پرستی کے نشہ میں سرشار، مادیت و شہوت پرستی کے والہ و شیدا، شک اور اضطراب کے شکار اور دنیاوی مکروہات کے گرفتار انسان" جنہیں عرفِ عام میں مہذب انسانوں سے تعبیر کیا جاتا ہے ایسا کہنے کی جرات کر بیٹھیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ فریبِ نفس زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپین تہذیب کے مکروہ اعمال نے اس دنیا کو ان کے لئے جہنم بنا دیا ہے اور یاس و نامرادی، حرمان و خذلان، فقدانِ راحت و اطمینان چاروں طرف سے ان پر یورش کر رہے ہیں اور دنیا باوجود اپنی فراخی اور روشنی کے ان کے لئے تنگ و تاریک ہو رہی ہے اور وہ اپنے اعمال کے بھیانک اور خوفناک نتائج سے مفر ڈھونڈنے کی سعئ لاحاصل میں مصروف نظر آرہے ہیں اور جیسا کہ ڈاکٹر میکس نار ڈو نے کہا ہے کہ "یورپ اور امریکہ میں راحت اور اطمینان کی تلاش کبریتِ احمر کی تلاش سے کم نہیں۔ جس ملک میں تم جاؤ وہیں تم پر یہ الم انگیز حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ ہر سوسائٹی میں عملِ تخریب نہایت سرعت سے اپنا کام کر رہا ہے"۔ آج

مغربی دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے اس التہاب کو تجربی علم اور سائنس کم نہیں کرسکتے اور ایک گروہ ارباب بصیرت کا ایسا پیدا ہو رہا ہے جو اس حقیقت کو تسلیم کرچکا ہے کہ یورپ کی اس آگ کو صرف ایمانِ ابراہیمی یا اسوۂ حسنۂ محمدی ہی گلزار بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ برناڈشا نے صاف طور پر کہا ہے کہ دُنیا یا تو بولشویک ہو جائے گی یا اسے اسلام کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔ مگر ظاہر ہے کہ بولشوزم دنیا کی تسلی نہیں کرسکتی کیونکہ اس کا دامن تمیر سے [illegible] خالی ہے اور عنقریب مغربی دنیا پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ سائنس باوجود اپنی ترقی کے ان [illegible] وا نہیں کرسکا بلکہ ان کے دُکھ کی دوا اس روحِ ایمانی میں ہے جو ایک گھاس کے تنکے سے لے کر سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں تک، ذرّے سے آفتابِ روشن تک، چاند کی گردش اور ستاروں کے نور میں سمندر کی موجوں اور دریاؤں کی روانی میں، صحرا کی خاموشی اور جنگل کی بادِ صرصر میں، باغوں کے درختوں پھلوں اور پھولوں میں غرض کائنات فطرت کے ایک ایک ذرّے میں جاری و ساری ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

ولہٗ اسلم من فی السمٰوات والارض

(اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے)

اور پھر فرمایا:۔

کل لہٗ قانتون

(سب کے سب اسی کے مطیع و منقاد ہیں)

اور اگر کوئی اس روحِ ایمانی سے بیگانہ ہے تو یہی بدبخت انسان جو اشرف المخلوقات ہو کر اسفل السافلین کے گڑھے میں گر چکا ہے۔

موجودہ تہذیب کی ناکامی کی داستان اتنی طویل ہے کہ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہاں اسی قدر ظاہر کر دینا کافی ہے کہ موجودہ زمانے کی عالمگیر بے اطمینانی جو کہیں سوشلزم کی صورت میں کہیں نہلزم کی شکل میں کہیں انارکزم کی شکل میں اور کہیں بولشویزم کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کا علی الاعلان اعتراف کر رہی ہے کہ موجودہ نظام بالکل بوسیدہ ہو چکا ہے اور شاید بنی نوعِ انسان اس روایتی بڑھیا کی طرح جو تمام دن سوت کاتا کرتی تھی اور شام کو اسے تار تار کر دیتی تھی اب پھر اپنا تمدن برباد کر کے ایک نئے تمدن کی تلاش میں سرگرداں ہونے کو ہیں۔

اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت فی الفور منکشف ہو جاتی ہے کہ یورپین تہذیب کا اصل مرض مذہب سے ہجر و بعد ہے۔ اس سے ہمارے اس دعوٰی کی تائید ہوتی ہے کہ انسان کی ہدایت کے لئے صرف

سائنس کافی نہیں اور مذہب کی ہدایت کے بغیر انسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرتا ہے جیسا کہ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں +

ممکن ہے کہ بعض سائنس دان یہ کہیں کہ تہذیب کی ناکامی میں سائنس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ ہر تہذیب کی ایک نہ ایک خصوصیت رہی ہے اور موجودہ تہذیب کی خصوصیت سائنس کی عظیم الشان ترقی ہے اور اسی لئے اس تہذیب کو سائنٹیفک تہذیب کہا جاتا ہے اور موجودہ زمانے کو عہدِ سائنس (Scientific age) اس لئے موجودہ تہذیب کی ناکامی دراصل سائنس کی ناکامی ہے۔ مگر باوجود اس کے اب بھی اکثر سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ فی زمانا سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ وہ ہر شعبے میں انسان کے لئے ایک کامل اور مکمل دستور العمل پیش کر سکتا ہے چنانچہ ایک مشہور فرانسیسی سائنس دان کا قول ہے کہ مذہب ظنیات سے اور سائنس یقینیات سے بحث کرتا ہے اس لئے سائنس کے ہوتے ہوئے مذہب غیر ضروری اور بیکار ہے۔ اسی لئے سائنس کو علم یقینی (Positive knowledge) کہا جاتا ہے۔ سائنس دان یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ سائنس میں ظن وتخمین کو بالکل دخل نہیں اور اس کا علم ایسا کامل ومکمل ہو چکا ہے اور انسان کے ہر شعبے کے متعلق اس کی معلومات ایسی حدِ کمال تک پہنچ چکی ہیں کہ ان میں شائبۂ نقصان یا احتمالِ نقص نہیں ہے اور اس کا تمام مخزن علوم یقینیات۔ سے لبریز ہے جس میں شک وریب کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ دعویٰ فریبِ نفس سے کم نہیں۔ ایسا کوئی سائنس معرضِ وجود میں نہیں جو کامل ومکمل ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ یا ظن اور تخمین سے بالا ہو سکے کیوں کہ موجودہ سائنس باوجود اس قدر ترقی کے ابھی تک بہت ہی ناقص اور محتاجِ تکمیل ہے۔ بس وہ انسانی رہنمائی کا فرض کیوں کر ادا کر سکتا ہے +

از خویشتن گم است کرا رہبری کند

مثال کے طور پر ہم سائنس کے دو عظیم الشان اصولوں کو پیش کرتے ہیں۔ پہلا اصول علت ومعلول کا ہے۔ دوسرا اصول بقائے مادہ اور بقائے قوت کا۔ ان کی اہمیت کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر ان دونوں اصولوں سے انکار کر دیا جائے تو سائنس کا محل دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ لیکن میں ان کے یقینی ہونے کے بارے میں دو مشہور سائنس دانوں کی رائے پر اکتفا کروں گا۔ موسیو ہنری پوائنکا ئرے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سائنس اور مفروضات" میں لکھتے ہیں "آج تک سائنس دان مسئلۂ بقائے قوت ومادہ کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے جسے کوئی صاحبِ عقل تسلیم کر سکے چنانچہ ایک سائل نے فرانس کے سب سے بڑے ماہرِ طبیعیات سے یہ سوال کیا کہ آپ کے پاس مسئلۂ بقائے قوت کا کیا ثبوت ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ ریاضی دانوں نے چونکہ اس مسئلے کو قیاس سے ثابت کر دیا ہے اس لئے ہمیں اس کا استقرائی ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ یورپ کے سب سے بڑے ریاضی دان کے پاس گیا اور وہی سوال اس نے اس سے کیا۔ اس نے اس کے جواب میں کہا کہ چونکہ ماہرین طبعیات اسے استقراء اور تجربے سے ثابت کر چکے ہیں اس لئے ریاضی نے اس کا قیاسی ثبوت

پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی"۔ اس پر تنقید لاحاصل ہے۔ اسی طرح مسئلہ علت ومعلول کے متعلق حکیم آئن سٹائن فرماتے ہیں کہ اس کو زیادہ سے زیادہ اتفاق واقتران سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ورنہ یوں مسئلہ علت ومعلول کی حقیقت ایک بہت ہی کمزور مفروضے سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے مشہور جرمن حکیم گوئٹے نے سائنس کو "غلطیوں کے بھنور اور گرداب سے" تعبیر کیا ہے۔ پس سائنس دانوں کے اس دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ سائنس ظن وتخمین سے بالکل پاک ہے اور اس کی عمارت مذہب کی طرح محض یقین وایمان پر قائم نہیں۔ انگلستان کے بیسویں صدی کے سب سے بڑے انشا پرداز ایڈورڈ کارپینٹر نے جسے انگریز بیسویں صدی کا پیغمبر کہتے ہیں اپنے رسائل "سائنس پر تنقید" (science, a criticism) "تہذیب کی بیماری کی علت اور اس کا علاج" (Civilisation. Its cause and cure) میں سائنس دانوں کے ان خیالات کی بڑے پُرزور الفاظ میں تردید کی ہے۔ میں انگریزی دان سائنس دانوں سے بہ زور کہوں گا کہ ان دونوں رسائل کا ضرور مطالعہ کریں کیوں کہ ان کے پڑھنے سے ان کی بہت سی غلطیاں دور ہوجائیں گی۔ کارپینٹر نے نہایت معقول دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نہ تو ہیئت وفلکیات، نہ کیمیا وطبعیات، نہ بائیولوجی اور زوی اولوجی، نہ سوشیالوجی اور اکنومکس اور نہ دیگر مزعومہ علوم سے ہمیں حقائق ویقینیات کا علم ہوسکتا ہے۔ اور مزعومہ قوانین فطرت بھی جنہیں سائنس دان اس قدر زور شور سے حقائق ثابتہ کے طور پر پیش کرتے ہیں محض تخمینی عمومیات ہیں (Vague generalisation) اور ہرگز قوانین فطرت کہلانے کے مستحق نہیں۔ وہ قوانین اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک ہمارا تجربہ محدود رہتا ہے۔ جوں جوں ہمارا علم وسیع ہوتا جاتا ہے ہمیں اتنا ہی زیادہ ان کے اسقام کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ جو چیز دس سال پہلے ایک قانون فطرت تھی وہ اب محض ظن کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جو آج قانون فطرت تسلیم کی جاتی ہے غالباً دس سال بعد اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔ اس لئے جسے ہم قانون فطرت کہتے ہیں وہ محض ہمارے تجربے کی حدبندی ہے۔ موسیو ہنری پوائنکارے سائنس دانوں کے قوانین فطرت کو کنوئیں کے مینڈک کی آواز سے تشبیہ دیتے ہیں جس طرح کنوئیں کا مینڈک اپنے کنوئیں کو سمندر سمجھتا ہے اسی طرح سائنس دان اپنے بہت ہی محدود علم کو اور اپنی اس سے بھی زیادہ محدود فضا کو فطرت اور عالم کے وسیع الفاظ سے یاد کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے خدا کو بھی اپنی چار دیواری میں محصور کرلیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر سائنس کے تجربات کی بنیاد اصلی حالات سے کامل انقطاع پر قائم کی جاتی ہے۔ ایڈورڈ کارپینٹر لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر ایک سائنس عمل تحلیل کے آلے کے استعمال سے حقائق سے منقطع ہوکر بالکل فرضی تصورات میں الجھ چکا ہے علم الاخلاق کی بنیاد افادیت وتوریث پر رکھ لی گئی ہے حالانکہ حقیقی علم الاخلاق اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے اور اس کا تعلق قلب انسانی کی ان مساعی سے ہے جو وہ روحانی معراج حاصل کرنے کے لئے عمل میں لاتا ہے حقیقی اقتصادیات وہی ہے جو انسان کے باہمی معاملات میں حق وانصاف، اعتدال وتوازن، خیرات واحسان، اخوت ومودت، نظم واجتماع،

کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر قاعدے اور کلیات بنائے۔ لیکن ہمارے علم الاقتصاد کی ابتدا ہی ان تمام جذبات کو نظرانداز کر کے کی جاتی ہے اور اس کی بنیاد محض خودغرضی، نفس پروری اور نفس پرستی پر رکھی جاتی ہے اور اس پر تمام عمارت کھڑی کر دی جاتی ہے۔ بائیولوجی میں نباتات حیوانات اور انسانات کی شخصیت و انفرادیت کو فنا کر کے کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی طرح اسے کیمیاوی جذب و انجذاب، طبعی فعل و انفعال، نطفہ اور پروٹوپلازم اور قوانین توالد و تناسل کی صورت میں محصور کر دیا جائے اور اسی طرح جسد کو روح سے الگ کر کے اس کی تحلیل و تجزیہ سے قوانین و نتائج کی ایک عمارت کھڑی کر لی جائے ——"

غرض کون سا علم ایسا ہے جس کی ترقی میں یہی رجعی عمل کارفرما نہیں ہے کہ اسے اصلیت سے ہر ممکن طریق سے منقطع کر دیا جائے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ایسے جسد بے روح سے انسان کی کیا خاک تسلی ہو سکتی ہے۔ انسان کو ضرورت تو اس امر کی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ وہ کس طرح اور کیوں کر اپنے معاملات مہر و محبت، حق و انصاف اور خیرات و احسان کو مدنظر رکھ کر اور جماعتی شیرازہ بندی کو قائم رکھتے ہوئے انجام دے۔ مگر اقتصادیات کا علم کہتا ہے کہ سب سے پہلے حق و انصاف مہر و محبت اور خیرات و احسان کے خیالات کو دل سے نکال دو۔ پھر میں تمہیں (Supply and Demand) طلب و رسد کا قانون بتاؤں گا۔ اس لئے ایسا علم بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنے کی بجائے انہیں اندھے گڑھے میں دھکیل دے گا۔ چنانچہ موجودہ عالمگیر کساد بازاری کی سب سے بڑی وجہ ہمارا غلط اقتصادی نظام ہے۔ اور اب اکثر ماہرین اقتصادیات و معاشیات اس امر کے معترف ہو چکے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام ہی اس عالمگیر تباہی کا ذمہ دار ہے۔ یہی حال دوسرے علوم کا ہے۔ اب ذرا اس سے آگے بڑھیے +

علم ہیئت ہمیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ آفتاب زمین سے کتنے کروڑ میل دور ہے۔ روشنی کی رفتار فضائے بسیط میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے۔ ایتھر میں سرخ، سفید یا بنفشئی روشنی کتنے ملیون لہریں پیدا کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ کہکشاں کی کیمیاوی تحلیل کیا ہے یا آفتاب میں ایک نیا مفرد ہیلیم موجود ہے۔ یہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ زمین آفتاب کے گرد کیوں کر گھوم رہی ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر خدارا یہ تو بتاؤ کہ اس سے انسان کو اس کا جواب کیوں کر مل سکتا ہے کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ، اپنے بچوں کے ساتھ، اپنے ماں باپ یا بہن بھائیوں کے ساتھ، ہمسایہ یا احباب کے ساتھ اور باقی دنیا والوں کے ساتھ کیا اور کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس کی روح اپنی تکمیل کے لئے بیقرار ہے اسے اس کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو علم ہیئت کیوں کر پورا کر سکتا ہے۔ اسی طرح آپ ہر علم سے یہی سوال کیجئے۔ بائیولوجی سے، کیمیا سے، فزکس سے یہی سوال کیجئے۔ کیا مادہ کی تحلیل برقیوں میں اور برقیوں کی تحلیل مثبت و منفی برق پاروں میں کرنے سے بجلی کو ایتھر کا ایک تموج ثابت کرنے سے مادہ روشنی حرارت اور بجلی کا ایک مبدأ ثابت کرنے سے انسان کے بدن کی ساخت کو یونیٹری سیلز (Unitary Cells) سے متعلق کرنے سے انسان کو ان

سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ سائنس نے اپنا دائرہ عمل انسان کے حقیقی دائرہ عمل سے اس قدر مختلف اور بیگانہ بنا لیا ہے کہ وہ کسی طرح بھی مذہب کی بجائے انسان کی رہنمائی کا فرض ادا نہیں کر سکتا اور سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے وہ انسان کو مذہب سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔

بے شک سائنس نے تسخیر فطرت سے بنی نوع انسان کی بہت اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس کے شواہد ہمارے سامنے ہیں ایکس رے (X. Ray) ٹیلیفون، تار برقی، لاسلکی، سٹیم انجن، برقی لیمپ اور بیشمار دوسری ایجادیں بنی نوع انسان کے لئے راحت کا سامان مہیا کر رہی ہیں اور ان کی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں شب و روز مصروف ہیں۔ لیکن یہ تمام فوائد ایک طرف اور ہلاکت اور تباہی کے آلات دوسری طرف رکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس خدمتِ نوع انسانی کی کیا حقیقت ہے اور صرف آلاتِ ہلاکت و حرب ہی پر کیا موقوف ہے۔ سائنس نے ظالم اور استعمار پسند حکومتوں کے ہاتھوں کو مضبوط کر کے قوموں کی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ساتھ ہی حاکم اقوام میں شہرت پرستی، ہوس کاری، ہوس رانی کا ایک ناقابلِ ضبط جذبۂ عیش و عشرت کی ایک غیر مختتم خواہش، خود غرضی اور نفس پروری کی اٹ محبت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اس امر کا خود یورپ کے اہلِ بصیرت کو اعتراف ہے مسٹر ہوور صدر جمہوریۂ امریکہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں امریکہ کے متعلق جو موجودہ سائنس اور تہذیب کا گہوارہ ہے۔ مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

"میرے خیال میں تمام بنی نوع انسان کی تاریخ ایسے تاریک زمانے کی مثال پیش نہیں کر سکتی جس میں انسانی زندگی، مال و متاع، عزت و ناموس ایسے ارزاں ہو گئے ہوں جیسے کہ ہمارے زمانے میں اضلاع متحدۂ امریکہ میں ہو چکے ہیں۔"

امریکہ میں تخویف مجرمانہ اور بردہ فروشی میں جس طریق پر سائنس کا استعمال کیا جا رہا ہے اور لنڈن، نیویارک، پیرس، برلن اور وائینا کی محفلہائے شبینہ کی گرم بازاری کے لئے سائنس جس طریق پر استعمال ہو رہا ہے قمار بازی، شراب خواری اور حرامکاری کو مہذب بنانے کے لئے جس طرح سائنس کو کام میں لایا جا رہا ہے وہ ہمارے علم اور سائنس کے لئے قابلِ فخر نہیں۔ کیا سائنس کے پاس ان مفاسد کے روکنے کا کوئی آلہ ہے مشینوں کے ذریعے سے جو ہلاکت و تباہی مزدور پیشہ جماعتوں پر آ رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو لنڈن، نیویارک اور برلن کے سلمز (Slums) (غربا کی رہائش کے علاقے) دیکھئے کہ وہاں کیوں کر انسان حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ ہم بمبئی کلکتہ اور ہندوستان کے شہروں میں اس کا نظارہ دیکھتے ہیں کہ کیونکر سائنس کی تمام ایجادیں زیادہ تر امرا کے عیش و آرام میں محدود معاون اور غربا کی زندگی کو بد سے بدتر بنانے میں مصروف ہیں۔ آپ اچھی سڑکیں، خوبصورت موٹریں، برقی تار، بجلیاں اور طرح طرح کی مشینیں دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سائنس کی مدد سے خوشحال ہو رہا ہے۔ مگر آپ کو کیا معلوم نہیں کہ ایک شہر بمبئی میں پانچ لاکھ آدمی ہر شب اس طرح سوتے ہیں کہ فرشِ زمین ان کا بچھونا اور سقفِ آسمان اُن کا اوڑھنا ہوتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوستان میں آٹھ کروڑ آدمی ایسے ہیں جو اڑتالیس گھنٹے میں ایک دفعہ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ کیا سائنس کی ترقی سے ہندوستان کے مصائب بڑھ گئے یا کم ہو گئے۔ اور ہندوستان پر کیا موقوف ہے تمام دنیا میں جہاں جائیے آپ کو یہی حقیقت نظر آئے گی ع۔

اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

حقیقت یہ ہے کہ سائنس شمشیرِ دو دم ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے مہالک و مضرات اگر اس کے مفاد سے زیادہ نہیں تو مساوی تو ضرور ہیں۔ اس لئے انسان کو اس کے مہالک و مضرات سے بچانے کے لئے خود اس کی روشنی کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انسان کو وحی آلہی کی ہدایت کی روشنی کی ضرورت ہے اور یہی مذہب ہے۔

قصہ مختصر خود یورپ اور مغربی دنیا کو ہلاکت سے بچانے کے لئے اس وقت صحیح اور سچی مذہبی سپرٹ کی ضرورت ہے اور مغرب میں جو فساد اور بے اطمینانی رونما ہو رہی ہے اس کا تریاق مذہب کے پاس ہے اس لئے دنیا کو غلامی اور جبر و استبداد، ظلم و فساد، تشکیک و اضطراب سے نجات دلانے کے لئے مذہب کو جلاوطن کرنے کی بجائے مذہب کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔ اربابِ بصیرت سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اس وقت انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ شک اور الحاد کا جو اسے کامل تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہا ہے دوسرا راستہ مذہب میں ایمان و ایقان کا جو اسے اس دلدل سے نکال کر حقیقی ترقی کی شاہراہ پر لے جا سکتا ہے اور اس پر چل کر بنی نوع انسان ایک دفعہ پھر اخوت و مساوات کے بھولے ہوئے سبق کو ازبر کر کے خدا کی بادشاہت کے قیام کو حقیقت ثابتہ بنا سکتے ہیں۔ مذہب نے انسان کے سامنے ایک بلند مطمح نظر رکھ دیا ہے۔ خدائی بادشاہت کا قیام، دنیا کو عدل و مساوات سے معمور کرنا۔ بنی نوع انسان کو بھائی بھائی بنا کر مصیبت و بیماری کو جلاوطن کرنا۔ کالے اور گورے، اسود و احمر اور امیر و غریب کے امتیازات کو بالکل مٹا کر ان کی جگہ عملِ صالح کے امتیاز کو قائم کرنا۔ مہذب انسان کو دیکھنا ہے کہ کیا وہ اس مطمح نظر کے حصول کے لئے اپنی مساعی کو وقف کر کے اس دنیا کو جنتِ ارضی بنانا چاہتا ہے یا اس کے مقابل دوسرا راستہ اختیار کر کے دنیا کو جہنم بنا کر اسے تباہی کے گڑھے میں دھکیل کر خود بھی تباہ و برباد ہونا چاہتا ہے۔ اس انتخاب پر دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔ حق و باطل کی قوتیں ایک آخری اور فیصلہ کن کشمکش میں مبتلا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حق ہمیشہ بے سروسامان رہا ہے اور خیلِ باطل ہمیشہ اپنی قوت کے گھمنڈ اور ساز و سامان کے غرور میں مست رہا ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حق کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے۔

وہ زمانہ قریب ہے جب مذہب کے مخالفین اور ان کے دوسرے ہم خیال سائنس دانوں کو یہ معلوم ہو گا کہ مذہب سے موجودہ ہجر و بعد ایک عارضی اور ناپائیدار حالت تھی جس کا دور ہونا ایسا ہی بدیہی تھا جیسا کہ طلوعِ آفتاب سے ظلمتِ شب کا۔ فافہم و تدبر۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

محمد علی

مسز براؤننگ نے چارلز کنگزلے سے پوچھا "تمہاری زندگی کا راز کیا ہے؟ مجھے بتاؤ کہ میں بھی اپنی زندگی کو ویسی ہی خوشنما بنا لوں"۔ اس نے کہا "میرا ایک دوست تھا"۔

جذباتِ امجد

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا　　جس نے غنچۂ دل کو باغِ دل کشا پایا

تیرے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہے　　اپنے آپ کو تجھ سے میں نے کب جدا پایا

آنکھ بند ہونے پر دید کی تمنا ہے　　آنکھ رکھ کے کیا دیکھا زندگی میں کیا پایا

ہم تو صاف کہہ دیں گے مل گیا خدا اس کو　　جس نے اس خدائی میں بندۂ خدا پایا

حیلہ ہاتھ آتا ہے خوب، پابوسی کا　　رکھ دیا قدم پر سر جب انہیں خفا پایا

ناامیدی و امید ساتھ ساتھ چلتی ہیں　　بارہا اسے کھویا اور بارہا پایا

سانس جس کو کہتے ہیں ایک پھانس ہے دل میں　　زندگی کے دھوکے میں موت کا مزا پایا

گرچہ یہ مسلم ہے علم ایک نقطہ ہے　　نقطۂ نظر اک کا ایک سے جدا پایا

جستجو ہی اے امجد رازِ کامیابی ہے
جس نے جابجا ڈھونڈا اس نے جابجا پایا

امجد

عطر کی شیشی

ایک شام احمد انارکلی میں سے گزر رہا تھا۔ جب پیر بخش بوٹ فروش کی دکان کے پاس پہنچا تو سامنے سے پہلے ایک ٹانگا پھر ایک موٹر، پھر چند بائیسکل والے پھر دو ایک اور موٹریں آگئیں۔ پیچھے سے بھی ٹانگوں کی گھنٹیاں، موٹروں کے ہارن آوازیں دینے لگے۔ آمد و رفت رک گئی۔ احمد کو بھی بائیسکل سے اترنا پڑا۔ وہ اتر کے داہنی طرف کو ہو لیا۔ بچتا بچاتا دس قدم بڑھا۔ مگر پھر وہی سماں تھا موٹر ہی موٹر، سائیکل ہی سائیکل! اس نے سوچا کہ ایک آدھ منٹ ٹھہر ہی لیا جائے تو اچھا ہوگا چنانچہ گدی پر کہنی ٹیک کر اور دائیں طرف کی دکانوں کے بالکل ہی قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ موٹر تانگے گزرتے گئے کہ اتنے میں اس کو پیچھے سے کسی نے آواز دی "بابو صاحب ذری بائیسکل کو سنبھا لئے یہ چیزیں نہ گرا دے، مڑکے جو دیکھا تو وہ کباڑیئے کی دکان تھی اور سائیکل تھا کہ اس کے کئی ایک پینل اور چینی کے ظروف سے جو باہر چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر دھرے تھے، بہت ہی نزدیک ہو رہا تھا۔ یونہی ایک آدھ انچ کی کسر رہ گئی تھی۔

احمد نے جلدی سے سائیکل اپنی طرف گھسیٹ لیا اور پھر ان برتنوں کو دیکھنے لگا جو قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی الماری تھی۔ اس میں پیالیاں، گلاس، چمچے گلدان وغیرہ پڑے تھے۔ احمد کی نظر پھسلتی ہوئی نیچے جو آئی تو کتابوں پر پڑی جو وہاں قطاریں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ رسالے بھی تھے۔ پاس ہی ایک آدھ چاء دانی پڑی تھی، دو ایک رنگ برنگ کے انڈے دان تھے۔ احمد کبھی کبھار اس دکان سے کوئی چیز خرید لیا کرتا تھا۔ گزشتہ سال ہی ایک ڈبی خریدی تھی، پھر دو ایک ماہ ہوئے ایک تپائی، اور یوں اکیلی دکیلی چیز بھی ادھر ادھر گزرتے خرید لیا کرتا تھا۔ چنانچہ دکان دار نے اسے پہچان لیا، کہنے لگا "اوہو آپ ہیں! معاف کیجئے چیزیں......" احمد نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ وہ تو کوئی بات نہیں" اور پھر بات ٹالنے کو "کہو کوئی نئی چیز ہے؟" "دیکھئے" دکان دار بولا بہت کچھ ہے یہ آپ نے پیالی دیکھی؟ اینمل کی ہے، چین کی بنی ہوئی ہے۔ ایک انگریز جا رہا تھا اسی کے سامان میں آئی ہے دیکھئے!

احمد نے اسے دیکھا مگر پسند نہ آئی، کہنے لگا کچھ اور دکھاؤ، دکان دار نے ایک پاس ہی پڑی ہوئی شیشی اٹھا کر کہا یہ دیکھئے یہ بھی وہیں سے ہاتھ لگی ہے۔ عطر کی شیشی ہے۔ بڑی عمدہ شئے ہے۔ آپ اوپر سے دبائیں تو اس چھوٹی سی موری میں سے پھوار نکلے گی۔ بہت قابل پسند ہے۔" احمد نے اسے پکڑ لیا۔ بدن شیشے کا تھا۔ ڈھکنا پیتل کا۔ اندر ایک نلی تھی۔ اوپر ڈھکنے میں وہی نلی نکل کر، ایک انچ اوپر ایک گول لٹوی میں ختم ہو جاتی تھی پہلو میں ایک

سوراخ تھا۔ احمد نے پہلے بھی اس قسم کی شیشی دیکھی تھی۔ اس نے خیال کیا چیز تو اچھی ہے اور ہے بھی سالم۔ نئی معلوم ہوتی ہے لے لیتے ہیں۔ بہار کو دے دیں گے۔ اسے ہے بھی خوشبو سے شوق۔ بہت پسند کرے گی +

بہار اختر اس کے خالو کی بھتیجی تھی۔ بہار کے والدین فوت ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنے تایا کے گھر رہتی تھی۔ اس کی والدہ اور خالہ نے جو پہلے ہی سے لاہور میں تھیں، مل کر مزنگ میں ایک بڑا سا گھر لے لیا تھا۔ گھر میں بڑا صحن تھا۔ تین طرف کمرے تھے اور چوتھی طرف باورچی خانہ اور غسل خانے۔ ایک طرف احمد کی خالہ اور اُن کا خاندان رہتا تھا اور بالمقابل احمد اور باقی کنبہ۔ تیسری طرف مردانہ تھا۔ بیرونی دروازے کے دائیں بائیں دو دیوان خانے تھے۔ دایاں احمد کے والد کا اور بایاں اس کے خالو کا۔ دوسری منزل میں بھی کمرے اسی لحاظ سے تقسیم کئے گئے تھے۔

احمد شیشی خرید کر نیلے گنبد کی طرف چلا۔ اب بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ سائیکل پر چڑھ بیٹھا ابھی چوک سے نہ گزرا تھا کہ خیال آیا یونہی خالی شیشی دینا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کیا کہے گی ؟ اگر چیز کسی کو پیش کی جائے تو پوری ہو یہ کیا کہ شیشی دے دی جائے اور عطر وہ ڈھونڈتی پھرے۔ خیال آتے ہی سائیکل سے اتر پڑا۔ واپس لوٹا۔ سیدھا بیلی رام کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے یاسمین کا عطر لیا۔ کیوں کہ یہ عطر اسے خود بہت پسند تھا اور اسے شک پڑتا تھا کہ بہار بھی ایک دن ایسنس آف جیسمن کی تعریف کر رہی تھی۔ شیشی لے اندر کی جیب میں حفاظت سے رکھی اور ایک خوشی کے احساس کے ساتھ سائیکل پر پھر سوار ہو گھر کو ہو لیا +

راستے میں سوچتا آیا کہ اب بہار کو یہ عطر دیا کیسے جائے۔ شام کا وقت ہے وہ خالہ جان کے دالان میں کہیں ہو گی اور ضرور کسی کام میں مشغول ہو گی۔ یا شاید کھانا ہی کھا رہی ہو۔ یا شاید کہیں زہرا سے یا مجیدہ سے باتوں میں مشغول ہو گی۔ اور ان دونوں کے سامنے یہ چیز دینا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ اگرچہ زہرا اور مجیدہ اس کی خالہ زاد بہنیں تھیں اور عمر میں بھی اس سے دو تین سال چھوٹی ہی ہوں گی۔ مگر بھئی اسے تو ان سے ڈر ہی لگتا تھا اور خصوصاً جب عید بھی گزر گئی اور اس نے کچھ بھی عیدی وغیرہ نہیں دی۔ مانا کہ عید کے دن اتفاق سے اس کا ایک پانچ روپے کا نوٹ کہیں گم ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں بٹوے میں سے کہاں چلا گیا، کہیں جیب سے نکل گیا، یا ڈائری نکالتے وقت ساتھ ہی آ گیا اور کہیں گر پڑا۔ بہر حال وہ نوٹ کھو ضرور گیا تھا۔ بہت جگہ تلاش کیا۔ مگر نہیں ملا۔ اپنے کمرے میں تو اس نے تمام جگہ ڈھونڈ مارا نشان تک نہیں ملا۔ مگر وہ کسی کو کیا بتاتا کہ روپے گم ہو گئے ہیں ؟ اور پھر عید کے دن اسلم حمید، اور اشرف آ گئے مجبور کر کے ساتھ لے گئے۔ کہیں ادھر، کہیں اُدھر، پھر حمید کے مکان پر چلے گئے۔ سب کی جیبوں سے جو کچھ روپیہ پیسہ تھا نکال لیا۔ جمع کر کے پھل اور رس گلے اور جانے کیا کیا منگوایا اور شام تک کھاتے رہے۔ عید کو پیسہ اس کے پاس خاک ہوتا ؟

گھر پہنچا تو سائیکل رکھ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا صحن کے دوسری طرف

بالمقابل دوسری منزل پر زہرا وغیرہ رہتی تھیں۔ دو کمرے تھے ایک بہار کا تھا ایک مجیدہ اور زہرا کا۔ کمروں کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں اس لئے احمد کے کمرے سے ان کمروں میں صاف نظر جاتی تھی۔ احمد کے ساتھ کا کمرہ محمودہ اور سعیدہ اس کی بہنوں کا تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی کی اور کپڑے اتارنے شروع کئے۔ پہلے عطر اور وہ شیشی نکال کر اپنی میز کی دراز میں رکھ دی۔ پاجامہ پہنا۔ قمیص کے اوپر سویٹر پہنا۔ آرام کرسی پر بیٹھنے کو جھکا مگر پھر کھڑا ہو گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ کھڑکی میں سے صحن میں جھانکا۔ باورچی خانہ روشن تھا۔ آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے کی کھڑکیاں بند تھیں، بہار کی اور زہرا کی بھی۔ البتہ روشندانوں سے پتا چلتا تھا بجلی جلتی ہے۔ وہیں کھڑا رہا۔ کبھی نیچے دیکھتا، کبھی سامنے، سوچا کہ اب یہ کیسے بہار کو دے دی جائیں۔ باورچی خانہ میں اگر جاتا ہے تو وہاں تو دے نہیں سکتا۔ گھر کے سب لوگ ہوں گے۔ کیا کہیں گے! یہ نہ کہیں گے کہ یہ خاص طور پر کیوں تحفے تحائف دئے جا رہے ہیں۔ خیال آتا کہ اچھا کل سہی مگر دل نہ مانتا۔ یہی جی چاہتا کہ ابھی دے دی جائیں ابھی۔ ابھی۔ تو کیسے؟ صحن میں جا کے اگر ٹہلنے لگ جائے تو شاید بہار ادھر ادھر گزرتی مل جائے مگر اس اچانک تحفہ سے وہ کیا سمجھے گی؟ سمجھے گی کیا! یہی کہ میں بازار سے گزر رہا تھا۔ یہ نظر پڑی تو اس کے لئے لیتا آیا۔ تو یہ سب کچھ کہنے کا کیسے موقع ملے گا؟ اور پھر وہ نہ کہے گی کہ میرے لئے کیوں خاص طور پر تکلیف کی۔ مگر یہ تو نہیں کہنے کی۔ بس میرا دل چاہا لے آیا۔ اور پھر اسے خوشبو پسند نہیں؟ اور خاص طور پر یاسمن کی؟ ہاں ہاں یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر فرض کرو اس نے انکار ہی کر دیا! اوہو! اگر واقعی انکار کر دے تو! آخر وہ کہہ بھی کیا سکتا ہے کہ ضرور لے لو۔ مجھے خوشی ہوگی اگر یہ عطر اور یہ شیشی لے لوگی! اچھا اگر وہ پوچھے کہ کیوں تمہیں کیوں خوشی ہوگی؟ مگر یہ بھی کبھی وہ پوچھ سکتی ہے؟ آخر اسے کچھ تو احساس ہوگا۔ بیسیوں دفعہ جب سے ہم یہاں رہنے لگے ہیں۔ اس نے مجھے یہاں کھڑکی کے پاس دیکھا ہے اور کئی دفعہ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پکڑا بھی ہے اور پھر یہ نہ بھی ہو تو ہنسی کھیل میں سو دفعہ ہی تو وہ کسی خاص احساس کے زیر اثر میرے الفاظ کو سن کر اور میری نظر ہی اپنے چہرے پر گڑی ہوئی محسوس کر کے شرما چکی ہے۔ نہیں جی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ یہ پوچھے کہ بھئی تمہیں کیوں خوشی ہوگی۔ بس۔ ہوگی۔ اس سوال کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی، آخر اسے کیا معلوم ہے کہ مجھے شیشی دیکھتے ہی اس کا خیال آ گیا اور میں نے بلا تامل خرید لی اور پھر بلا مزید غور و خوض کے عطر بھی خرید لیا۔ کہیں یہ سب غلط ہی نہ ہو۔ وہ یہ نہ کہے کہ پاگل تو نہیں ہو گئے! مجھے شیشیاں دیتے پھرتے ہو! میں تمہاری رشتہ میں کیا ہوئی؟ لاحول ولا۔ یہ تو کبھی نہیں کہہ سکتی۔ آخر چار پانچ مہینے ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے، اور اس اثنا میں سینکڑوں دفعہ اکٹھے اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ تو خالہ جان ہی فرشتہ ہیں۔ انہوں نے پردہ وغیرہ لغویات کا سوال ہی نہیں اٹھایا زہرا مجیدہ کی طرح بہار سے بھی بے تکلفی رہی ہے مگر جی یہ بے تکلفی اور ہے، وہ بات ہی اور ہے۔ تو پھر کیا کروں؟ . . . . . " سوچتا، جھنجھلاتا، اٹھتا بیٹھتا، کمرے میں چکر لگاتا مگر تسکین نہ ہوتی اور دل کسی طرح نہ مانتا

کہ اب لایا بھی ہوں تو اسے نہ دوں۔

یکدم کسی فوری خیال کے ماتحت کرسی گھسیٹ میز پر جا بیٹھا۔ قلم اٹھا پیڈ کھینچ کر کچھ لکھنا شروع کر دیا "پیاری بہار میں آج شام کو انارکلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " یہیں تک پہنچا تھا کہ خیالات نے وہ یورش کی کہ قلم رُک گیا۔ لاحول ولاقوۃ یہ کیا کرنے لگا تھا۔ خط! خط!! اور بہار کو!!! وہ کیا کہتی!! اور اگر کسی کو معلوم ہو جائے تو! فوراً ہی اس نے کاغذ پیڈ میں سے اکھاڑ کر پھاڑ دیا۔ پرزہ پرزہ کر کے نیچے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹوکری باہر کھینچ کر وہ پرزے چن لئے اور جو جو اُن میں سے بڑا تھا اس کو پھر پھاڑا۔ اس کے بعد کچھ پھر ٹوکری میں ڈال دئے۔ کچھ مٹھی میں رکھے۔ پھر پشت پر جو کھڑکی گلی میں کھلتی تھی اس میں سے ایک ایک کر کے پھینک دئے۔

مگر پشیمانی بہت محسوس کر رہا تھا۔ اور سوچتا تو دل کی حرکت تیز ہو جاتی۔ کہ یہ بھی کیا ہو جانے کو تھا۔ خط! وہ کیوں ؟ اب جو سوچتا تو کوئی وجہ نہ ملتی۔ کوئی جواز نہ سوجھتا۔ اپنی عجلت پر اور اندھا دھند عجلت پر شرم آتی۔ لاحول ولا! کتنی بیوقوفی کرنے کو تھا۔ اور پھر پیاری بہار! واہ! پیاری بہار! میری پیاری بہار کیوں نہیں، میری جان سے پیاری بہار کیوں نہیں! وہ بھی کہتی اُلّو ہے کہیں کا۔ بالکل پاگل ہے بے شرم! فوراً ہی خالو کے پاس یا خالہ جان کے پاس چلی جاتی کہ دیکھئے یہ آپ کے بھانجے کیا کرتوت کر رہے ہیں۔ یا زہرہ اور مجیدہ سے کہتی یہ لو اپنے خالہ کے بیٹے کو دیکھو کیسے پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں۔ زہرا اور مجیدہ! توبہ! قیامت آجاتی مگر یہ بات نہ انہیں بھولتی۔ کیا خالہ جان اور امی جان اور کیا محمودہ اور سعیدہ ایک آفت مچ جاتی۔ توبہ! کتنی غلطی کرنے کو تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا شاید منہ پر مار دیتی کہ دفع ہو میرے سامنے سے شیشیاں لایا ہے کہیں سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ تو نہ ہوتا یہ تو کبھی نہ ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہار تو ایسی نہیں ہے۔ یوں تو بالکل نہ ہوتا! اگر میں اسے پیش کر دیتا کہتا بہار لو یہ میں تمہارے واسطے لایا ہوں۔ یہ عطر دانی ہے یہ یاسمن کا عطر ہے یاسمن تمہیں پسند ہے نا۔ وہی ہے۔ یہ لو۔ اس شیشی کو کھول کر اس میں عطر ڈال دینا پھر بند کر کے اس گول سی ٹوپی کو دبا دینا۔ یہ ہے نا چھوٹا سا منہ بنا ہوا۔ اس میں ایک باریک سوراخ ہے۔ بس اس میں سے پھوار نکلے گی کپڑوں میں لگا دینا۔ دوپٹے میں لگا لینا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بستر پر نیم دراز یہ سوچ رہا تھا۔ یہاں تک پہنچا تھا کہ فوراً خیال آیا کہ کیا بک رہا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ کیا ہو گیا دماغ کو۔ یہ بھی کیا بچپن ہے۔ لڑکیوں کی طرح! بیہودہ! جذبات پرستی! دوپٹہ میں لگا لو۔ کیوں نہ بالوں میں لگا لو، ہاتھوں پر انڈیل کر منہ پر اُبٹنے کی طرح مل لو۔ دیوار سے کھینچ مارتی ۔ ۔ ۔ ۔ تو پھر لیا ہی کیوں تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لینا ہی نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت نہ سمجھ آئی تھی۔

یونہی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے صبح سے کچھ کھایا نہ تھا۔ اس دن دوپہر کو کالج میں کوئی جلسہ تھا اس لئے گھر آ کے چاء بھی نہ پی سکا تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر پلنگ پر سے ہلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شاید خیالات نے حرکت کرنے کے ارادہ کو بھی دبا رکھا تھا۔ کیوں کہ دماغ میں خیالات اڑے چلے جاتے تھے۔ ایسی سرعت سے تانا بانا تن جاتے تھے کہ احمد سے کچھ بن نہ

آتا تھا۔ البتہ گزشتہ آدھ گھنٹے میں جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا اس سے اس کے دل میں ایک جھجک سی پیدا ہوگئی تھی۔
سوچتا کہ اگر میں دے ہی دیتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں کہتا اس دن تم ذکر کر رہی تھیں نا کہ تمہارا عطر ختم ہوگیا ہے۔ شیشی مجھے آج یونہی ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس لئے ساتھ میں تمہارے لئے عطر بھی خرید لایا۔ ضرور لے لیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی! پھر وہ کل یا پرسوں یا جس دن کپڑے بدلتی تو خوشبو لگاتی۔ مگر اسے خوشبو لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے تو جب کبھی اس کے قریب ہونے کا اتفاق ہوا ہے اس سے کوئی خوشبو آتی ضرور ہی محسوس ہوئی ہے۔ مثلاً اس دن جب صحن میں محمودہ اس کا تعاقب کر رہی تھی، شاید بہار نے محمودہ کی سہیلی کا خط چھین لیا تھا، تو میرے پاس سے بہار، بہت ہی قریب ہو کر گزری تھی۔ بلکہ میرے گرد تو ان دونوں نے دو تین چکر بھی لگائے تھے تو کیسی بھینی بھینی سی لپٹ آئی تھی کسی نامعلوم ہی خوشبو کی لپٹ تھی۔ دونوں کے دوپٹے اتر گئے تھے۔ اس ہاتھ سے دوپٹہ سنبھال لیتی کبھی اُس سے۔ کیسا دلکش نظارہ تھا۔ بہار گرگابی پہنے ہوئے تھی مگر پھر بھی کتنا تیز دوڑتی تھی۔ ہرنی کی طرح چھلانگیں لگا رہی تھی۔ دوڑ میں اس کے جسم میں ایسی لچک پیدا ہوتی جیسے پانی میں کوئی ہموار لہر اٹھ رہی ہے۔ کیا بل کھاتی جاتی تھی۔ سارا صحن رقص کرتا دکھائی دیتا تھا۔ جب کبھی کسی چارپائی کے آر پار کھڑے ہو کر محمودہ کو دھوکا دینے کی غرض سے ادھر ادھر اپنے بدن کو جھکاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ننھا سا خوش رنگ درخت ہوا میں جھوم رہا ہے۔ احمد ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ بہار کا جسم نہیں کسی نغمہ کی لے ہے۔ مگر اب جو خیال کرتا تو ایسے محسوس ہوتا کہ کوئی بہار کو چھیننے لئے جا رہا ہے۔ ....

پھر خط کا خیال آجاتا تو وہ دم بخود ہو کے رہ جاتا۔ کتنا تہور! کتنی ناسمجھی! اور پھر کس بے تکلف طور پر خط شروع کر دیا۔ "پیاری بہار" جیسے اسے کبھی اور کچھ کہا ہی نہیں۔ وہ بھی کیا کہتی؟ احمد یہ بار بار سوچتا۔ وہ بھی کیا کہتی! اسے کیا پتا ہے کہ وہ چھپ چھپ کے اپنے کمرے سے اسے صحن میں چلتے پھرتے دیکھا کرتا ہے۔ یا جب کبھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی ہو یا کچھ بُن رہی ہو...... اسے تو پتا نہیں...... اسے کیا پتا؟ احمد کو اب محسوس ہونا شروع ہوا کہ اسے بہار سے کتنی محبت ہے۔ مگر کہاں بہار اور کہاں وہ! خالہ جان! زہرا! مجیدہ! خالو جان! امی جان! محمودہ! سعیدہ! اتنی آنکھیں! اور وہ اور بہار! ...... کہاں بہار اپنے شباب سے بھی بے پروا! اور کہاں وہ خود........ اور وہ خط! ....

کمرے میں روشنی تھی۔ احمد کی نظر چھت سے ہٹ کر دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں پر رُکتی ہٹتی، پھر پڑتی۔ مگر احمد خود ایسے محسوس کرتا جیسے وہ کہیں سخت تاریکی میں جا رہا ہے اور اسے راستہ معلوم نہیں۔ اس کی اپنی بیچارگی اور پھر خط لکھنے کی ندامت مستقبل کی دھندلی فضا میں اسے لے جا رہی تھی مگر اسے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ فقط دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ خود ہی ایک خیال اس کے دماغ پر مسلط ہوتا جا رہا تھا کہ اگر وہ شیشی بہار کو دے دیتا تو شاید اس چھوٹی سی رنگین دنیا میں جو بہار کے وجود سے مہک رہی تھی ایک تہلکہ مچ جاتا۔

وہ کچھ دیر ویسے ہی بستر پر بغیر کسی خیال کے لیٹا رہا۔ پھر اٹھا اور دروازہ کھول کر ان دونوں شیشیوں کو نکال کر اپنے ٹرنک میں سب کپڑوں کے نیچے ایک گوشے میں چھپا دیا۔

فیاض محمود

راحت کدہ

دل بادہ کشِ طرب نہیں ہے
ہوتا تھا کبھی پر اب نہیں ہے

بے سود ہے جستجوئے راحت
وہ "راحتِ جاں" ہی جب نہیں ہے

زخموں سے ہوں چور چور لیکن
آلودۂ شکوہ لب نہیں ہے

خوشیاں تو بہت سی ہیں جہاں میں
دل ہی کو مگر طلب نہیں ہے

جل بجھ کے تباہ ہو گیا دل
افسردگی بے سبب نہیں ہے

کب آہِ سحر نہیں ہے ہمدم!
کب گریۂ نیم شب نہیں ہے

جب دیکھو اثرؔ کو رو رہا ہے
مر جائے تو کچھ عجب نہیں ہے

اثر صہبائی

میرے ایک دوست

دوستوں کے معاملے میں مجھے دنیا سے بہت کچھ شکایت ہے۔ اُصولاً ہر معاہدے میں طرفین کی رضامندی ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مجھ سے ہمیشہ یہ سلوک ہوا کہ کسی صاحب نے مجھے دوستی کے قابل سمجھا اور مجھ سے بغیر استشارہ کئے، مجھے بغیر اطلاع دئے، دوست بنا لیا۔ پھر اُن میں سے بعض تو اس قدر اخلاص و محبت کا ثبوت دیتے ہیں کہ دوست سے لے کر بلائے بے درماں بن جانے تک کے تمام منازل نہایت برق رفتاری کے ساتھ طے کر کے خود میرے گھر کو اپنا گھر تصور فرما لیتے ہیں۔ خیال کیجئے کہ لوؤں کے مہینے میں، بارہ بجے دوپہر کو میرے ایک کرم فرما قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ "ادھر سے گزر رہا تھا، میں نے کہا آپ سے بھی ملتا چلوں!" میں سنتا ہوں اور اپنی اخلاقی بزدلی پر ماتم کرتا ہوں۔ کہ اللہ ایک یہ شخص ہے جو قصداً میرے مکان پر آنا بھی باعثِ عار سمجھتا ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود اس کی مہمانی کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن اس قسم کے علاوہ ایک دوسری قسم بھی ہے +

عزیز صاحب میرے ایک پرانے بلکہ "تاریخی" کرم فرما ہیں۔ ان کے متعلق اتنا تو بالکل یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسان ہیں اس لئے کہ عام انسانوں کی طرح وہ طویل القامت، مجبور الاکل اور "سگرٹ نوش" حیوان ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اُن میں چند خصوصیات ایسی بھی ہیں جو عام انسانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً چھ سال کے متواتر تعلق کے بعد بھی میں آج تک یہ پتا لگانے میں کامیاب نہیں ہُوا کہ عزیز صاحب کے ہونٹ ایک ازلی تبسم کے ساتھ اُلٹے کان کی طرف کیوں مائل رہتے ہیں۔ یا یہ کہ چلتے ہوئے اُن کا تمام جسم پیسا کے جھکے ہوئے مینار کی طرح اپنے مرکزِ ثقل کو مرکزِ حجم سے جدا رکھنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

پیشے کے اعتبار سے وکالت کو عزیز صاحب کی شمولیت سے سرفرازی حاصل ہے۔ لیکن اُن کے جاننے والوں میں سے ہر شخص کو یہ خوب معلوم ہے کہ انھوں نے یہ پیشہ محض اپنے "ذوقِ مقننی" کے لئے اختیار کیا ہے۔ ورنہ نہ وہ موکلوں کی زیادہ پروا کرتے ہیں نہ ان میں ہوشیاری و پرکاری جیسی "وکیلانہ" خصوصیات ہی موجود ہیں۔ لیکن اُن کی "سادگی" میں وہ حسن ہے جو بڑے سے بڑے وکیل کے "سنگھار" میں نہ ہوگا۔ ایک نیا موکل آتا ہے اور رسمی طور پر، محض رسمی طور پر خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ اُجرت کے متعلق جملہ امور طے کر لیں۔ لیکن عزیز صاحب ان ابتدائی مراحل کو اس قدر دلچسپی اور سرگرمی کے انداز میں طے کرتے ہیں کہ موکل کے دماغ میں اصل مسئلہ کے متعلق بہت ہی کم مواد باقی رہ جاتا ہے۔ ایک دن میں

موجود تھا کہ اُن کے بالاخانے پر جسے "وہ آفس" کہنے اور کہلوانے پر مصر ہیں، اُن کا ایک دوست ایک موکل کی حیثیت سے آیا اور ابتدائی جملوں کے بعد کہنے لگا "دیکھئے صاحب! دوستی اور بات ہے اور کام دوسری چیز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کام شروع کرنے سے پہلے تمام کاروباری معاملات کا تصفیہ کر لیا جائے"۔ میں سمجھ گیا کہ اُس کی مراد اجرت سے تھی۔ میں نے متوقع آنکھوں سے دیکھنا چاہا کہ عزیز صاحب کس قسم کا چالاک وکیلانہ جواب دیں گے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وکیل و موکل کے درمیان جو میز حائل تھی وہ عزیز صاحب کے پیہم پہلو بدلنے کی وجہ سے زلزلے کی سی کیفیات پیش کر رہی تھی۔ دوسرے لمحہ میں عزیز صاحب نے اپنے کان میں سے دیاسلائی کھینچی اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے چہرے سے وہ تمام سلوٹیں جو کان کریدتے وقت پیدا ہو جاتی ہیں دور ہو گئیں۔ انہوں نے قلمدان میں سے اپنا قلم اٹھایا اور میز پر اس کو بجاتے ہوئے نہایت بے باکی سے کہا "آپ نے سچ کہا میں خود بھی چاہتا ہوں کہ روپے پیسے کی بات چیت پہلے ہی طے ہو جائے"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ موکل پر اس کا کیا اثر ہوا کم سے کم میں جیتے کی "نازپرور" سادگی سے یہ سمجھا کہ عزیز صاحب تکلوت کی سی باتیں کر رہے ہیں اور اُٹھ کر چلا آیا۔

لباس کے معاملے میں عزیز صاحب بہت "محتاط" واقع ہوئے ہیں۔ محتاط سے مراد میری یہ نہیں کہ وہ خوش سلیقگی کو نمایاں کرنا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ کپڑوں کا جوڑا ایک مرتبہ دُھل جانے کے بعد جس قدر طویل عرصے تک ایک بے نفس وکیل پہن سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ عرصے تک وہ اُس کی خدمات حاصل کرنے پر مصر رہتے ہیں۔ کپڑوں ہی کے سلسلے میں عزیز صاحب کی "معاملہ فہمی" پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُن کو یقین ہے کہ شیروانی اتار دینے کے بعد جس چیز پر لوگوں کی نظریں پڑتی ہیں وہ کُرتا ہوتا ہے نہ کہ بنیان۔ نتیجہ ظاہر ہے اگر کُرتا ایک ہفتہ چل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بنیان دو ہفتے تک نہ چل سکے۔ معاملہ لوگوں کو معلوم نہ ہوتا، اگر گرمی کی بدحواسیاں اُن کے کرتے کا گریبان نہ کھول دیا کریں۔ کیفیت سے قطع نظر عزیز صاحب کے پاس قریب قریب اجزائے لباس اُتنے ہی ہوتے ہیں جتنے ایک معمولی انسان کے پاس۔ خصوصاً رومال تو اُن کے لئے ایک ناگزیر چیز ہے۔ قلمی بڑے کھا کر، مرچ بھرے ہاتھ پونچھنے کے لئے نزلہ کے دنوں میں بہتی ناک کا قائم مقام بننے کے لئے باغ میں لیٹے ہوئے گیلی گھاس کو توڑتے رہنے کے بعد ہاتھوں کی مٹی اور سبزی صاف کرنے کے لئے ان کے پاس صرف ایک ہی چیز ہے یعنی ان کا رومال ـــ ان متنوع فرائض کو انجام دینے کے بعد رومال میں ایک مخصوص کیفیت باقی رہ جاتی ہے۔ جسے منہ پھٹ لوگ سڑاند سے تعبیر کرتے ہیں۔ بیشتر حالات میں یہ سڑاند ان کی جیب ہی تک محدود رہتی ہے لیکن جب کبھی عزیز صاحب "ذوقِ مظاہرہ" سے مجبور ہو کر اپنے محبوب رومال کو سرِمجلس ٹھنک ٹھنک کر گھٹنے پر سلا دیتے ہیں تو حاضرین کی ناک میں نکسیر پھوٹنے کی سی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ لباس کے سلسلے میں اُن کی دوسری خصوصیات بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ مثلاً شیروانی میں ہمیشہ اوپر کے تین چار بٹن آپ کھلے پائیں گے۔ اُن کا شرعی پاجامہ ٹخنوں سے دو تین انچ اوپر ہوگا۔ اور "امریکن ٹو" کے شو میں اُن کا سخت و کرخت پاؤں جرابوں سے ہمیشہ محروم۔ غالباً لباس سے عزیز صاحب کی بے اعتنائی، یہ جتانے کی ایک کوشش ہے کہ انسان کی عزت اس کے لباس

پر موقوف نہیں۔ لاریب عزیز صاحب کا حلقۂ معتقدین ان کے جسم اور لباس میں خفیف سا تعلق نہ پاکر بھی اُن کی اسی قدر عزت کرسکتا ہے جتنی ایک لبادہ پوش انسان کی۔ اس لئے کہ عزیز صاحب کی دلچسپیاں اُن کے لباس کی ممنون نہیں بلکہ اُن میں اُن کے دماغی زوایا کی ترکیب نے چند ایسی خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو صرف اُن کی ہیں۔

عزیز صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی گھبراہٹ ہے یہ گھبراہٹ مختلف مقامات پر مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ تعارف کے مواقع پر، سراسیمگی کے اس قدر شدید آثار اُن پر طاری ہوتے ہیں کہ اس وقت کم از کم ایک گز کے احاطے کے اندر ان کے قرب و جوار میں پڑی ہوئی ایک چیز محفوظ نہیں سمجھی جاسکتی۔ جس وارفتگی کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لئے وہ لپکتے ہیں اور جس شدتِ خلوص کا مظاہرہ وہ اپنی گرفت سے کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

عزیز صاحب کو ایک "نادرۂ روزگار" کی طرح اپنے ساتھ رکھنے کا میں عادی ہوں۔ ایک دن ان کے ہمراہ میں اپنے ایک دوست کے مکان پر گیا۔ اتفاقاً وہاں ایک اور صاحب جن کو نہ میں جانتا تھا اور نہ عزیز صاحب بیٹھے ہوئے دن کے دو بجے شیو بنا رہے تھے۔ صاحبِ خانہ نے میرا تعارف کرایا اور میں اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے مڑا۔ میں نے دیکھا کہ عزیز صاحب وہاں پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ عزیز صاحب میں ایک خاص بات ہے کہ وہ اگر کسی نشست کو پسند کر لیتے ہیں تو صاحبِ نشست کے اُٹھتے ہی بلا تکلف اپنی جگہ سے وہاں منتقل ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو اس "جاگیری" کی لذت سے سرشار ہو کر اور کچھ "شوقِ تعارف" سے بے تاب ہو کر وہ اپنی جگہ سے دوڑے۔ صاحبِ خانہ نے ان کا تعارف کرایا۔ ہمارے "نومتعارف دوست"، اس تمام عرصہ میں شیو کرتے رہے تھے۔ لیکن تکمیل تعارف کے بعد عزیز صاحب نے سب سے اہم سماجی فرض ادا کرنے کے لئے نہایت سُرعت کے ساتھ اس میز کا رخ کیا۔ جہاں شیشہ اور شیو کا دوسرا سامان رکھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے مقابل کو تیار نہ پاکر کچھ جھجکے۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے استرا چھینا اور آخر ہاتھ ملا کر چھوڑا۔ اس کشمکش میں شیشہ اور متفرق سامان میز پر سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

عزیز صاحب کی اس گھبراہٹ کے مناظر زیادہ تر شارعِ عام پر دکھائی دیتے ہیں۔ پٹڑی سے سڑک پر اور سڑک سے پٹڑی پر تانگوں اور موٹروں کی یورش سے بچنے کے لئے جیسا عجیب "رقصِ لبسمل" اُن کے چلنے میں نمایاں ہوتا ہے اُس کی بہترین مثال کے طور پر میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ دہلی کے اس بازار میں سے جس کا نام ہی عزیز صاحب پر حیائے دوشیزگی" کے تمام اثرات طاری کئے بغیر نہیں رہتا۔ ایک دن وہ گزر رہے تھے حسبِ معمول میں اُن کے ساتھ تھا۔ لوگوں پر یہ واضح کر دینے کے لئے کہ وہ محض کام کی غرض سے گزر رہے ہیں انہوں نے اپنی رفتار غیر معمولی طور پر تیز کر دی اور ساتھ ہی ساتھ بہت تندی اور انہماک کے ساتھ میری طرف منہ کئے باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ عزیز صاحب کے بالکل سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک تانگہ پٹڑی سے لگا کھڑا ہے۔ اس تانگے میں ایک نوجوان عورت پیچھے کی نشست پر اپنے سامنے کچھ برتن رکھے ہوئے بیٹھی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہی

ہے۔ میں بربنائے احتیاط پٹڑی پر ہو گیا۔ لیکن عزیز صاحب کی گفتگو بہت شدّت سے جاری تھی اور وہ اُس میں اس قدر منہمک تھے کہ گرد و پیش سے بالکل بے خبر تھے۔ یکایک عزیز صاحب کی پنڈلیوں کا وسطی حصہ نہایت بے دردی کے ساتھ تانگے سے متصادم ہُوا اور طرفۃ العین میں اُن کے دونوں ہاتھ ایک عجیب بے کسی کے عالم میں اُس عورت کے گھٹنوں سے کچھ اوپر جا ٹکے۔ جھٹکے سے عزیز صاحب کی ترکی ٹوپی اُس کی گود میں پہنچ چکی تھی عزیز صاحب کا منہ اُسی زاویۂ منفرجہ پر قائم تھا جہاں اُسے اس حادثہ سے پہلے اُن کی گفتگو پہنچا چکی تھی، رہیں اُن کی آنکھیں تو اُن کی کچھ نہ پوچھئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی مسافر کو اچانک جنگل میں شیر مل گیا یا کسی جواری کو ایک دم پولیس نے آپکڑا۔ اُن کی مسترحمانہ اور ملتجیانہ وضع یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کہیں پہلے اس عورت کو گزند پہنچا چکے ہیں اور اب بمنت معافی کے خواستگار ہیں میں نے یہ مضحکہ انگیز منظر دیکھا اور اپنے تئیں بے قابو پاکر آگے نکل گیا۔ کوئی دو منٹ کے بعد عزیز صاحب کا ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ وہ کہہ رہے تھے "کس قدر بیہودگی ہوئی ہے یار! توبہ"

قدرت نے عزیز صاحب کو تخیل بھی بہت قوی عطا کیا ہے اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ تنہا مقامات میں جہاں آدمی کا گزر نہیں ہوتا۔ اپنے کسی دوست کو آتا ہُوا تصور کر لیتے ہیں۔ اور اس کے سلام کے جواب میں مُسکراتے ہوئے، بہت تپاک کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر خود بھی سلام کرتے ہیں۔ اس روز شام کے چھ بجے باغ میں عزیز صاحب کا اپنے "ہوائی" دوست کو سلام کرنا، پھر گھبرا کر ہمیں دیکھنا اور عرق آلود ہو جانا آسانی سے بھولنے والی چیز نہیں۔ تخیل کی فراوانی سے جہاں اُن کی حرکتیں بظاہر غیر معقول معلوم ہوتی ہیں۔ وہیں بعض اوقات ان کے کلام میں بھی تَغلُک پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ہوسٹل کے ایک کمرے میں، ایک نہایت سنجیدہ گفتگو کے درمیان اُن کا یکایک کمرے والے سے یہ پوچھ بیٹھنا کہ "آپ یہاں آخر پڑھتے کیسے ہوں گے"۔ اُن کے ہمدارح کو یاد ہے۔ عزیز صاحب کے بہترین مفسروں کی شروح اور حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کو سمجھنے سے پہلے محذوفات اور مقدرات کا ایک سلسلہ روپوش ماننا پڑے گا۔

(۱) کمرے کے قریب گرجا گھر کی موجودگی

(۲) گرجا گھر میں گھنٹے کی موجودگی

(۳) گھنٹے کا ہر اتوار کو بجنا

(۴) آواز سے کچھ عرصے کے لئے مطالعے میں خلل پڑنا۔

(۵) کمرے میں رہنے والے کا امتحان کی تیاری کرنے کی وجہ سے عین گھنٹہ بجنے کے وقت پڑھنے پر مجبور ہونا وغیرہ وغیـــــرہ۔

اسی ضمن میں ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ عزیز صاحب مجلس میں بیٹھے بیٹھے یا بازار میں چلتے چلتے، بعض اوقات اس قدر ناموزوں طریقے پر اپنے آپ سے گربڑ کر جاتے ہیں کہ ان کے ساتھیوں کی آنکھیں حیرت د

تعجب سے "چراغ کعبہ" بن کے رہ جاتی ہیں۔ عدالت میں گزرے ہوئے یا پیش آنے والے واقعات کو، گھر میں رونما شدہ حادثات کو، یا آئندہ سے متعلق اپنے ارادوں کو، عزیز صاحب اپنی پوری وارفتگی کے انداز میں ہاتھ ہلانے، منہ بنانے، آنکھیں بند کرکے کھول دینے، گردن میں خم پیدا کرنے اور اسی قسم کی دوسری حرکات سے رُسوا کرنے کے عادی ہیں ——— اس حال میں کہ اُن سے اس قسم کی کسی چیز کی توقع ان مواقع پر نہیں کی جاتی۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے عزیز صاحب کی صحتِ دماغ کے متعلق اپنے شبہات ایک خوف زدہ سرگوشی میں مجھ سے بیان کئے معلوم ہوا کہ ایک شب اس نے جامع مسجد کے قریب میرے دوست کو تنہا، خود اپنی موجودگی ہی میں تقریر کرتے ہوئے پایا تھا

شدتِ تخیل کے بالکل برعکس عزیز صاحب کی قوتِ فہم بہت ناتواں ہے۔ عام طور پر اپنی نافہمی کو وہ اپنی خودداری سے چھپا لینے کے عادی ہیں۔ اگر کسی جملہ کا مطلب ان کے دماغ تک نہ پہنچ سکے تو عزیز صاحب ایک دانستہ انداز کے ساتھ مُسکرا کر اپنے پاؤں پر سے میل اتارنے لگتے ہیں یا موضوعِ گفتگو بدل دیتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہمیشہ نہ میل اتارنا ممکن ہے نہ موضوعِ گفتگو کو بدل دینا۔ ان شکلوں میں جس قسم کا سامانِ تفریح ان کی ذلت سے پیدا ہوتا ہے اس کا شاہکار نذر ہے۔ کالج کی اردو ڈرامیٹک کلب نے گزشتہ سال "Pantomimic" (خاموش ڈراما) دکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے عزیز صاحب کو دعوت دی کہ آپ بھی چلیئے۔ انہوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ، انکار کیا۔ میں نے پوچھا "کیوں کیا آپ کو پسند نہیں، یا پہلے کبھی دیکھ چکے ہیں؟" عزیز صاحب کے جواب نے میرے حواس منتشر کر دئے،

"نہ کبھی دیکھا ہے نہ پڑھا"

"نہ پڑھا کیا معنی؟"

میں قریب قریب چیخ اٹھا۔ عزیز صاحب نے ایک مطمئن کن انداز میں کہا "ارے میاں شیکسپیر کا ڈراما ہے نا؟"

غالباً نافہمی ہی کی وجہ سے عزیز صاحب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن سے جو جملہ کہا جائے وہ تکمیل کے لحاظ سے کسی اضافے کا محتاج نہ ہو۔ اور جب کبھی اُن کے سامنے کوئی ایسا جملہ بولا جاتا ہے جس کا مفہوم الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے تو عزیز صاحب اس "ایجاز" کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے جہل اور حماقت کے تمام شواہد اپنے چہرے پر پھیلا کر جملے کی "لغویت" پر روشنی ڈال دیتے ہیں۔ ایک روز کیرم (Carrum) کھیلتے ہوئے یکایک عزیز صاحب پر علمی تجسس کی سی کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے پوچھا "کیوں بھئی یہ سٹرائیکر (Striker) کس چیز کا بنا ہوا ہوتا ہے؟ ہاتھی دانت کا؟"

"نہیں ہڈی کا"

"آدمی کی ہڈی کا؟"

(ایک زبردست قہقہہ)

"ہیں اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے!"

"عزیز صاحب یہ کسی جانور کی ہڈی کا بنایا جاتا ہے۔"

"تو مردِ خدا پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ جانور کی ہڈی کا ہوتا ہے!"

عزیز صاحب کو "ہندوستانی تماشوں" سے ایک فنی عداوت ہے۔ لیکن دوستوں کی دعوت کو رد کرنا اُن کا شعار نہیں۔ ایک دن محض ان کی تنقید کا لطف اٹھانے کے لئے ان سے کہہ دیا گیا کہ آج شام آپ کو ایک نہایت دلچسپ ہندوستانی تماشا دکھایا جائے گا۔ عزیز صاحب حلوا سوہن، پستے کی لوز، اور قلاقند کی چڑ رکھنے والے لوگوں کی طرح بہت برا بھلا کہتے ہوئے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ڈراما ہالیوڈ کی بہترین خاموش تصاویر میں سے تھا عزیز صاحب نے حسبِ توقع ڈراما شروع ہوتے ہی اپنی کوفت اور ملال کا اظہار کیا "دیکھتے ہیں آپ، یہ ہے آپ کا ہندوستانی ڈراما لاحول ولا قوۃ"، اس جملے سے قدرتی طور پر جو قہقہہ عزیز صاحب کے متعدد ساتھیوں میں پیدا ہوا اُسے انہوں نے اُس شخص کا مضحکہ سمجھا جو ہم سب کو ہندوستانی تماشا دکھانے کی حماقت کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ وہ خود بھی بے ساختہ طور پر رانوں پر ہاتھ مار مار کر گردن کو جھٹکے دے دے کر ہنستے ہوئے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بار بار فرماتے رہے "کیا اچھا ہندوستانی تماشا ہے بھائی۔ واہ" اُن کے قہقہوں سے ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور بلا مبالغہ نہ صرف اُن کے ساتھی بلکہ قریب بیٹھنے والے لوگ بھی کافی دیر تک ہنسا کئے۔

اب تک عزیز صاحب کی جو صفات بیان کی گئیں وہ "انسانی" نہ تھیں یعنی ان صفات کا ان کی ذات بحیثیت انسان ہونے کے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن میں ابتدا ہی میں کہہ چکا ہوں کہ عزیز صاحب کے انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مزید ثبوت اُس غیر معمولی جذبۂ ہمدردی سے ملتا ہے، جس کا فقدان انسانیت کے منافی سمجھا جاتا ہے اور جو عزیز صاحب میں بہ فضلِ خدا بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بیشتر یہ ہمدردی صرف ناک سکڑ جانے، ہونٹوں کے کچھ پھیل جانے، یا انتہائی صورتوں میں آنکھ بند ہو جانے تک ہی محدود رہتی ہے۔ لیکن جب کبھی ان کا یہ درد لفظوں میں تبدیل ہو جائے تو ہمدردی کا مقصدِ اعلیٰ یعنی مخاطب کا غم غلط کر دینا بہت خوبصورتی کے ساتھ پورا ہو جاتا ہے۔ کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ عزیز صاحب کے پاس ان کا ایک دوست ملاقات کے لئے گیا۔ انہوں نے شکایتہً کہا کہ آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔

اس شخص نے کہا "جی ہاں۔ کیا عرض کروں۔ ایک ایسا ہی حادثہ پیش آ گیا تھا"

عزیز صاحب ہمدردی سے متاثر ہو کر بولے "خیریت؟"

"میری دادی کا انتقال ہو گیا تھا ———"

ہیں! کیا کہا آپ نے؟ ——— آپ کی دادی کا انتقال ہو گیا؟

"جی!"

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"

اس قسم کی بدحواسیوں سے جیسا کہ بعد میں انہوں نے کہا کون بڑے سے بڑا آدمی محفوظ ہے؟

عزیز صاحب کی معصومیت کوئی مستقل خصوصیت نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عام رنگ ہے جو ان کی ہر خصوصیت میں بطور پس منظر کے نظر آتا ہے۔ دنیا کی چالوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرت نے ان کے اردگرد، اُن کے دوستوں کا ایک مستحکم قلعہ چن دیا ہے۔ اس مختصر سی دنیا میں انہیں حسب ضرورت ہر قسم کا شخص مل جاتا ہے۔ ان کے دوستوں میں سے ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ اُن کے زرد رنگ، خاتون نما جسم، اور عام کمزوری پر اُن کی توجہ منعطف کرتے رہتے ہیں۔ ایک اور صاحب ہیں جن کا فرض لباس اور بالوں کی قطع و برید کے متعلق مشورہ دینا ہے۔ ایک تیسرے کرم فرما نے تصحیح زبان کے متعلق اپنی خدمات مفت نذر کی ہیں۔ ایک چوتھے مخلص نے گاہے گاہے "مزاج پرسی" کا پُر ازخطر کام اپنے ذمے لیا ہے۔ دربار میں ایک منجم کی کمی تھی۔ قدرت نے اُسے بھی پورا کیا۔ فہیم، جس نے نجوم اور فراست الید استاد یا کتابوں سے نہیں بلکہ خدائے بخشندہ سے سیکھی تھی اور جو اس فن کے اصول سے اتنا ہی واقف تھا جتنے عزیز صاحب خود، اُن سے متعارف ہُوا۔ بات میں سے بات نکلی اور آخرکار عزیز صاحب کا ہاتھ دیکھا جانے لگا۔ خطِ دماغ اور خطِ عمر کو عبور کرنے کے بعد خطِ قلب کی نوبت آئی۔ ہم سب نے دیکھا کہ عزیز صاحب پر محسوس قسم کی اختلاجی کیفیت طاری ہوئی۔ فہیم نے مصنوعی دہشت زدگی کے ساتھ چونک کر عزیز صاحب کے چہرے کو دیکھا اور ایک "بولتے ہوئے" انداز میں شرم سے گردن جھکا لی۔ شاید عزیز صاحب خود نہ پوچھتے۔ لیکن اُن کے "اخلاقیاتی انچارج" نے تفصیل چاہی۔ فہیم نے کہا کہ "شاید عزیز صاحب کبھی بچپن میں یا نوجوانی میں ذرا ——— ذرا ——— میرا مطلب یہ ہے کہ ذرا ——— شوخ رہے ہیں" ہم میں سے ہر شخص نے ایک دوسرے کے چٹکی لی۔ اس چیز میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ شوخی اور عزیز صاحب کے درمیان ہر ممکن دیوار حائل ہے۔ لیکن اس کے متعلق ہمارا ایمان بالغیب تھا۔ خود عزیز صاحب کے چہرے پر کھنڈی ہوئی ندیدوں سے اس کی تکذیب ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلو بدلنے کے بعد انہوں نے کہا "جی ہاں" میں ——— "مشیرِ اخلاقیات" نے زیادہ تفصیل کے خلاف احتجاج کیا اور وہ خاموش ہو رہے۔ ممکن ہے اس بیان سے متاثر ہو کر بعض اصحاب عزیز صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ضروری سمجھیں۔ ایسے حضرات کو ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ وہ یہ کہ عزیز صاحب کو خود اپنی دلچسپ خصوصیات کے متعلق کوئی احساس نہیں ہے۔ اور یہی بہتر ہے۔ اس لئے کہ دوسری صورت میں ان کا حلقہ اُن کو یا محض ایک مسخرے کی حیثیت سے دیکھ سکے گا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ یا ایک معقول انسان کی حیثیت سے جس کے لئے ہم تیار نہیں۔

نوٹ:- کیرکٹر سب فرضی ہیں۔

انیس احمد رُشدی

غزل

وہ اپنے جاں نثاروں پر عنایت ہی نہیں کرتے
یہ بہتر تھا کہ ہم اُن سے محبّت ہی نہیں کرتے

نگاہیں ترجمانِ خواہشِ بیدادِ پیہم ہیں
ہم اُن سے عرضِ بیتابی کی جرأت ہی نہیں کرتے

نہ ہوتے ہم اگر مستِ مئے میخانۂ الفت!
جنابِ شیخ کے ہاتھوں پہ بیعت ہی نہیں کرتے

بتاتی ہیں ادائیں ہم ستم کو دوست رکھتے ہیں
نگاہیں کہہ رہی ہیں ہم مروّت ہی نہیں کرتے

کشیدہ پر نظر۔ لب پر تبسّم۔ راز کی باتیں!
یہ پھر کہئے کسی سے ہم محبت ہی نہیں کرتے

جنابِ شیخ ہیں ساقی پلاتا ہے نہیں پیتے
جنابِ شادؔ ہیں۔ کفرانِ نعمت ہی نہیں کرتے

شادؔ عارفی

ایک تصویر

مصوّر۔ شرید کیا تم بہت مصروف ہو؟

شرید۔ نہیں، کیا کوئی نئی تصویر دکھانا چاہتے ہو؟

مصوّر۔ ایک نہیں دس مگر شرط یہ ہے کہ تم کسی سے ذکر نہ کرنا

شرید۔ یہ کیوں؟

مصوّر۔ یہ دس تصویریں میری تمام زندگی کا شاہکار ہی نہیں میری زندگی ہیں۔ جن تصویروں کو فروخت کر کے روزی کماتا ہوں وہ نقلی ہیں یہ اصلی ہیں۔ میری مشہور تصویریں اندھوں کے لئے ہیں میری یہ تصویریں جو اب تمہیں دکھاؤں گا صرف ان کے لئے ہیں جن کی آنکھیں سطح سے نیچے کی چیزیں دیکھ سکتی ہیں۔

شرید۔ تصویر کو سطح کے نیچے سے کیا تعلق؟

مصوّر۔ یہی تو بات ہے۔ یہ تصویریں کسی شخص کی نہیں، کسی مکان کی نہیں، کسی باغ کی نہیں شخص، مکان، باغ سب کچھ ان تصویروں میں موجود ہے مگر مکان یا باغ کی حیثیت سے نہیں۔ یہ تصویریں **وقت** کی تصویریں ہیں۔ دُنیا میں کوئی نہیں جو وقت کو دیکھ سکے۔ مگر میرا دعویٰ ہے کہ میں نہ صرف وقت کو دیکھ سکتا ہوں بلکہ اوروں کو بھی دکھا سکتا ہوں۔ آؤ اب تصویریں دیکھو۔

(دونوں اندر ایک کمرے میں جاتے ہیں)

کمرہ بالکل تاریک ہے مصور کے پاس ایک بجلی کی مشعل (Torch) ہے اس کی روشنی زمین پر پاؤں کے آگے آگے پڑتی جاتی ہے۔ یک لخت مصور ایک طرف مُڑ کر مشعل کی روشنی بند کر دیتا ہے۔

مصوّر۔ لو اب پہلی تصویر تمہیں دکھاتا ہوں (مصور ایک پردہ ہٹا کر ایک تصویر والے چوکھٹے پر روشنی ڈالتا ہے)

شرید۔ اف، غضب، ستم۔ یہ وقت کس پر گزرا؟

مصوّر۔ ایک حسین عورت پر جس کا شوہر مالدار تھا۔

شرید۔ کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ حسن اور دولت نے اس عورت کو یوں مقید کر لیا جیسے پنجرے میں کوئی طوطا ہو اور ماہ و سال میاں مٹھو، میاں مٹھو کہتا اسی پنجرے میں مر جائے یعنی انسان سے یہ عورت طوطا بن گئی؟ کس قدر تم بے رحم ہو۔

مصوّر۔ بے رحم ضرور ہوں مگر کس قدر سچا ہوں اور تم نے ابھی پورا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا اور غور سے دیکھو۔

شریر۔ ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ حسن و دولت کی قید نہیں بلکہ ان سے سخت تر قید ہی۔ سب سے کڑی زنجیر ایک مقررہ طرز زندگی ہے یعنی مقررہ معمول کہ نوکروں سے کام لیا جارہا ہے۔ کھانے پر مہمان آرہے ہیں، کہیں جارہے ہیں، کسی کو بلا رہے ہیں۔ عزت کی آرزو ہے، دولت کے کم ہونے کا ڈر ہے، اُف ظالم یہ خیال نہیں کیسے آیا کہ مقررہ معمول روح انسانی کو کچا کھاجانے والی ڈائن ہے؟

مصوّر۔ یہ نہ پوچھو۔ ابھی تم تصویر کو ذرا اور غور سے دیکھو

شریر۔ دیکھا، خوب دیکھا، او بے رحم ظالم خدا کے لئے اس تصویر کو پھاڑ۔ میں تو چند منٹ اگر اور دیکھوں گا (حالانکہ کافی سنگدل ہوں) تو پاگل ہوجاؤں گا۔ یہی مطلب ہے نا کہ چالیس سال کا ایک مقررہ معمول اور وہی ایک گھر اور تھوڑے سے ردو بدل سے وہی ایک فرنیچر؟

مصوّر۔ ہاں کسی حد تک تم سمجھ چلے ہو کہ اس معمول کی باقاعدگی، اور ایک مکان کے روزانہ توارد سے روحِ انسانی میں کیا تنزل پیدا ہوتا ہے مگر ذرا اور دیکھو۔

شریر۔ دیکھ رہا ہوں۔ چالیس سال تک وہی دولت، وہی نوکر، وہی مکان، وہی مقررہ روز کی نشست و برخاست، وہی اکل و شرب، وہی پرانے دقیانوسی قہقہے، ارے ارے غضب۔ اب سمجھ میں آیا۔ اور وہی ایک شوہر۔ اف اف میں بھاگتا ہوں۔ یہ تصویر نہیں بلا ہے۔ یہ وقت نہیں جام مرگ ہے +

مصوّر۔ تم نے دیکھا کہ یہ کیوں ہے؟

شریر۔ خوب دیکھا۔ سب اس لئے کہ اس گھر میں بچہ نہیں ہے۔

مصوّر۔ آؤ اور دیکھو۔

شریر۔ نہیں دوست، معاف کرو۔ مجھ میں دل گردہ نہیں ہے کہ تمہاری اصلی تصویریں دیکھوں۔

عبدالعزیز

کام کی باتیں

گُن مایا[1] کے کون نہ جانے مایا سب کو بھاتی
مایا سے مُنہ مت موڑو تم دُنیا یہ سمجھاتی
سب ساتھی ہیں مایا کے، سب دُنیا مایا ماتی
کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

کہنے کو سب کہا کریں "ہے دولت آنی جانی"
دھیان لگا کے سوچو جو تم ہے یہ بات پرانی
منہ سے کہیں سب آنی جانی، جی سے ہے من مانی
کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

ہے پیسے سے گھر گھر شادی اور مبارکبادی
پیسے کے سب جلسے ہیں اور پیسے کی آبادی

[1] عرفِ عام میں دولت کو کہتے ہیں

آنکھ پھاڑ کے دیکھو جگ میں پیسہ ہے آزادی

کرو کام کی باتیں لوگو کام سے مایا آتی

مات پتا پیسے کے ساتھی، ساتھی جورو جاتا

سچّی بات جو پوچھے کوئی، پیسہ ہے اَنُ داتا

ہاتھ ہلاؤ، پاؤں چلاؤ، کام سے رکھّو ناتا

کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

ہے دھن دولت سارے جگ کے بگڑے کام بناتی

روٹھے بالک کو بھی دیکھو، اس کی جھلک مناتی

سچ کہتے مقبولؔ سُنو، بن مایا عزّت جاتی

کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

سید مقبول حسین

(احمد پوری)

ثروت

میں سمجھتی تھی کہ دُنیا میں مجھ سا بدنصیب کوئی نہیں اور رنج و مصائب آفات و آلام بنائے گئے تھے مجھے اور صرف مجھے برباد کرنے کے لئے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ ایک دن خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے (سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں) مجھے ثروت آرا سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ کیا بتاؤں اس کے دلکش چہرے پر حزن و ملال کا کیسا دل سوز نظارہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ غمگین تھی، مجھ سے زیادہ آزردہ اور مجھ سے پہلے دُنیا کو اس مکار اور فریبی دنیا کو خیرباد کہنے کے لئے تیار، اُسے بھی میری طرح چُپ لگ رہی تھی۔ وہ بھی غم و الم کی اُسی منزل میں تھی جس میں کہ میں۔ یہ منزل، یہ جانکاہ اور ہلاکت بار منزل، خدا اس سے دشمن کو بھی محفوظ رکھے اپنے مسافر کو اپنی آغوش میں لے کر ہی چھوڑتی ہے۔ ہم پر وہ زمانہ گزر چکا تھا جب انسان اپنی مصیبتوں کو دیکھ کر بیگانہ وار ہنس دیتا ہے۔ اس کے لئے غم، غم نہیں رہتا۔ وہ ہر نئے غم کا اور ہر نئی مصیبت کا نہایت خندہ پیشانی سے اور بلند قہقہوں کے ساتھ اقبال کرتا ہے۔ خویش و اقارب اُس کی یہ حالت دیکھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ اب سے کوئی رنج نہیں۔ مگر ایک گھُن، ایک رنج اسے اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے اور یہ بلند قہقہے نہایت سُرعت کے ساتھ اُسے ہلاکت کے عمیق ترین گڑھے میں دھکیل لے جاتے ہیں۔ جب اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو اُسے چُپ لگ جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی وہ اُف نہیں کرتا اور اسی کے بعد کا درجہ موت ہے۔ اگر اس حالت میں وہ اپنے دل کا رنج رو کر یا کسی ہمراز کو قصۂ غم سنا کر ہلکا نہیں کر لیتا تو یہ سمجھنا چاہئیے کہ موت اُس سے نہایت قریب ہے۔

ثروت کی اور میری حالت بالکل یکساں تھی۔ نہ میرا کوئی ہمراز تھا نہ اُس کا۔ ہمیں پیہم آفتوں اور مسلسل مصیبتوں کی وجہ سے چپ لگ رہی تھی اور ہم دونوں دعا کرتے تھے کہ خدا ہمیں جلد سے جلد اس "نامراد" دنیا سے اُٹھا لے پہلی ملاقات میں ایک دوسری کو اتنا زیادہ ہلاکِ غم دیکھ کر مجھے ثروت سے اور ثروت کو مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ آہ ——— اس ہمدردی نے ہمیں اور زیادہ آفتوں میں مُبتلا کر دیا۔ کاش ہم ناآشنا ہی رہتے اور ہماری زندگیوں کا، مصائب سے مملو زندگیوں کا کبھی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

اگر کسی کے سر میں بہت زیادہ درد ہو اور دوسرا شخص بھی اسی درد میں مبتلا ہو جائے تو جتنا وہ ایک دوسرے کے درد کو محسوس کریں گے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہی حال میرا اور ثروت کا تھا۔ میں جس کے ہوش و حواس رنج و الم کی بارشوں نے اپنے طوفانوں میں کھو دئے تھے۔ جسے قدرت نے صرف مصیبتیں اٹھانے کے لئے پیدا کیا تھا

جس سے اُس کا محبوب ترین دوست، موت، ظالم اور سنگدل موت کے ہاتھوں زبردستی چھینا جاچکا تھا یہ سمجھنے لگی کہ ثروت مجھ سے کہیں زیادہ ستم زدہ ہے اور اگر میری زندگی کی قربانی سے اُس کے صدمات میں کچھ کمی آگئی تو یہ میری بقیہ زندگی کا بہترین مصرف ہوگا اور ثروت کی باتوں سے بھی یہ پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے انتہائی ہمدردی رکھتی ہے

دو مہینے ایسے کٹے کہ کبھی میں ثروت کی مہمان ہوتی اور کبھی وہ میری۔ ہمیں آپس میں اتنی محبّت ہوگئی کہ ایک کے بغیر دوسری کا حال بے حال ہونے لگا۔ میں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنا لیا کہ ثروت کو مصائب کی خوفناک بلاؤں سے بچاؤں اور اس کام میں دُنیا کے دوسرے جھگڑوں کو فراموش کرکے ہمہ تن مصروف ہوگئی مجھے اپنے رنج یاد نہ رہے۔ ثروت کو، ثروت کی خراب حالت کو دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھنے لگی۔ ان دومہینوں میں اُس نے مجھے اپنا ہمراز کامل طور پر تو نہیں بنایا۔ ہاں البتہ اپنی مصیبت کی داستان کے کہیں کہیں سے دو ایک ٹکڑے سنا دئے۔ اُس کی یہ بپتا سُن کر مجھے اُس سے اور زیادہ ہمدردی پیدا ہوگئی کیوں کہ میں بھی اسی قسم کی مصیبت کا شکار تھی۔ اس کی صحبت سے میری مصیبت میں تو بہت کچھ تخفیف ہوگئی۔ مگر ثروت کی بیماری روز بہ روز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کا سا زرد ہوگیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور ضعف کا یہ عالم تھا کہ دس بیس قدم بھی نہ چل سکتی تھی۔ میں اُس کی نازک حالت سے خائف رہنے لگی۔ اسے ہنسانے کی کوشش کرتی مگر ناکام رہتی۔ اُسے رُلانا چاہتی مگر وہ خاموش بیٹھی رہتی۔ کئی کئی گھنٹے خاموش بیٹھی رہتی۔ میری منّتیں، میری خوشامدیں میری نصیحتیں سب بے اثر ثابت ہوتیں۔ کبھی یہ ہوتا کہ میرے لگاتار سمجھانے پر وہ اپنے نرم وگداز بازو میری گردن میں حمائل کردیتی اور میرے شانے پر اپنا سر رکھ کر اپنی ناکامیوں پر چند آنسو بہاتی اور بیہوش ہوجاتی۔ ـــــ بیہوش۔ یہ وقت نہایت خطرناک ہوتا کیوں کہ مجھے تنہا اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنی پڑتیں اگر کوئی اور اس اثنا میں اس کے متعلق پوچھتا تو میں کہہ دیتی "آرام کررہی ہے"۔ جوں جوں وقت گزرتا میری جان گھٹتی جاتی، اور پھر نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہوگیا کہ ایک دن اسی بیہوشی میں یہ بدنصیب مجھ کو روتا چھوڑ کر اس ناپاک اور مکروہ دنیا سے منہ موڑ لے گئی۔

ثروت کے والد چار سال پہلے جنت کو سدھار گئے تھے۔ اور شاید اُسی وقت سے اُس کی اس بے کیف اور پُرغم زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب اُن کے گھر میں ثروت، ثروت کی والدہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ مجھے اس طرح ثروت سے وابستہ دیکھ کر سبھی مجھ سے محبّت کرنے لگے تھے۔ میرا یہ حال تھا کہ اگر ثروت سو رہی تو میں نے بھی کچھ دیر کے لئے آنکھ جھپکا لی اور اگر وہ جاگتی رہی تو ساری رات اُس کے ساتھ بیدار رہ کر گزار دی۔ غرضکہ جو کام کرتا وہ ثروت کے ساتھ اور اُسے ذرا دیر کو تنہا نہ چھوڑنا۔ اسی طرح ہمارے گھر والے بھی اس کی قدر کرنے لگے کیوں کہ اس کی وجہ سے صرف اُس کی وجہ سے مجھ میں ازسرِنو زندگی آگئی تھی۔ ورنہ کوئی ایسا نہ تھا

جو میری زیست سے مایوس نہ ہو چکا ہو۔ انہوں نے ثروت کی صحبت کو غنیمت جانا کہ اس سے میری طبیعت بظاہر پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اگر ثروت جئے تو میں زندہ رہوں ورنہ اس کے ساتھ ہی میں بھی اس دنیا کو خیرباد کہہ دوں۔ ثروت پر دن رات ایک والہانہ بے خودی، ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی اور کبھی کبھی کسی خیال میں ایسی مست ہو جاتی اور اتنی بے خبر کہ پاگل معلوم ہونے لگتی۔ میں ڈرتی کہ کہیں یہ کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نہ بھاگ جائے۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی چھت کو تکتی رہتی یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں سے، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے سفید سفید موتیوں کی لڑیاں بندھ جاتیں مگر اس شان سے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے اور لبوں پر مہر سکوت لگی ہے۔ اُس کی اس بے بسی پر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی سینہ پھوٹ جائے گا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی، اُس کے خیالات کو بدلنا چاہتی تھی مگر وہ اسی بے بسی سے میرے چہرے کو تکتی رہتی اور میں اُس کی مجبوری اور ناچاری پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔

اُس کے پاس ایک تصویر تھی۔ میں ذرا دیر کو کہیں جاتی اور وہ فوراً اپنا سوٹ کیس کھول کر تصویر دیکھنے لگتی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ سوٹ کیس کو بند کر دیتی یا تصویر کو چھپا لیتی۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھا مگر اُس نے کچھ نہ بتایا۔ میرے اس قسم کے سب سوالوں کا اُس کے پاس ایک جواب تھا ——— خاموشی۔ اور اُس کی اس خاموشی نے مجھے تنگ کر رکھا تھا۔ ایک روز بیٹھی تصویر کو نہایت انہماک کے ساتھ تک رہی تھی۔ میں دبے پاؤں گئی اور اُس کی پشت کی جانب کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ اُس نے جونہی تصویر کے آئینہ میں میرا عکس دیکھا فوراً تصویر کو کپڑوں میں چھپا دیا اور خود سوٹ کیس کو بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی۔ شاید یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ میں نے ہر چند خوشامد کی، کوشش کی، ضد کی کہ کسی طرح وہ مجھے اس تصویر کے متعلق کچھ بتا دے مگر اُس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ نیچی نظریں کئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد آنکھیں اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ آخر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں خاموش ہو گئی۔

میں نے اس عرصہ میں اُس کے متعلق بہت عجیب باتیں سنیں۔ مگر اعتبار کبھی نہیں کیا۔ رشتہ دار تو اُن کے بہت تھے اور تھے بھی قریبی۔ مگر "دوست" ایک بھی نہ تھا۔ ایک رشتہ دار تو خاص طور پر ان کی دشمن تھی۔ کم بخت نت نئے طوفان اٹھاتی رہتی تھی، مگر ثروت کی ذات ان کمینہ بہتانوں اور رذیل طوفانوں سے بہت بالاتر تھی۔ میں نے اپنی ساری عمر میں ایسی معصوم اور پاکیزہ خصائل لڑکی کبھی نہ دیکھی تھی۔ نمازی ——— تہجد گزار ——— ہر وقت قرآن شریف کی تلاوت، ہر وقت اپنے خیالوں میں محو رہنے والی اور دُنیا سے بے تعلق۔ ثروت کی طینت

اُس کے رشتہ داروں سے بہت بلند تھی۔ اُس نے اُن کی کسی بات کا کبھی جواب نہیں دیا۔ اور جب میں پوچھا کرتی تو عام طور پر چپ ہو جاتی یا صرف اتنا کہتی "خدا سب کچھ دیکھتا ہے"۔

پہلے ثروت کو بہ ظاہر کوئی ایسا مرض نہ تھا جس کا طبیبوں سے علاج کرایا جا سکتا۔ کئی مرتبہ مشہور ڈاکٹروں اور نامور حکیموں نے دیکھا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہی کہتے رہے کہ اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے اُس کی وجہ سے یہ روز بہ روز سوکھتی جاتی ہے۔ دل کی تقویت کی دوائیں دیں، فرحتِ دماغ کے شربت پلائے مگر کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ ان کی ہدایت کے بہ موجب گھر کے ہر ایک فرد نے ثروت کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اُس کے خیالات کو بدلنے کی سعی بھی، مگر اُس کی حالت میں سرِ مو فرق نہ ہُوا۔ رفتہ رفتہ بخار رہنے لگا۔ دن رات بدن تپتا رہتا۔ اور اُس کی ہذیانی کیفیت میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ اس مرتبہ پھر طبیبوں کی طرف رجوع کرنا پڑا اور سب نے متفق ہو کر تپ دِق تجویز کیا۔ اس مرض کا، اس نامراد مرض کا نام سُن کر ثروت کی زندگی کی رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی میں نے ہر چند کوشش کی کہ ثروت کو اپنی بیماری کا حال معلوم نہ ہو مگر وہ تو بلا کی فہیم تھی۔ آثار و قرائن ہی سے سمجھ گئی اور کبھی کبھی موت کے خیال سے مطمئن سی ہو جاتی۔

اُس کی بیماری میں شب و روز اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے گھر والوں کی مالی حالت پہلے ہی ایسی اچھی نہ تھی کہ ایسے مہلک مرض کا اعلیٰ پیمانے پر علاج کرا سکتے دوسرے لگاتار بیماری نے انہیں اور زیادہ زیر بار کر دیا تھا۔ پھر ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اُسے کس طرح کسی پہاڑی مقام پر لے جاتے، بہت غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی کہ اپنے زیوروں کو بیچ کر ثروت کو پہاڑ پر لے جاؤں۔ میں نے انتظام کر بھی لیا تھا مگر ثروت کو عین وقت پر معلوم ہو گیا اور اس نے میری سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ دھرم پور جانے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی اور میرے اصرار پر کہنے لگی "اگر تم مجھے زیادہ تنگ کرو گی تو یاد رکھو میں ضرور کچھ کر بیٹھوں گی" یہ فقرہ ایسا نہ تھا کہ میں معمولی سمجھ کر ٹال دیتی۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ ثروت جو کہتی ہے وہ کر دکھاتی ہے اس لئے پھر میں نے اُسے لے جانے کے لئے نہ کہا۔

اُس کی زندگی سے مایوسی تو سبھی کو ہو گئی تھی مگر میرے لئے یہ مایوسی نہایت جاں گداز تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ثروت کا مرض مجھے لگ جائے۔ میں نے نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگیں ـــــــ اُس کی چارپائی کے چکر کاٹتے ہوئے التجائیں کیں کہ ثروت اچھی ہو جائے اور میں اُس کی جگہ بیمار ہو جاؤں مگر نہ دعائیں پوری ہوئیں نہ التجا۔

ایک دن رشتہ داروں میں ایک موت ہو گئی۔ ثروت کی والدہ وہاں چلی گئیں اور بھائی اسکول۔ میں اُس کے پاس اکیلی رہ گئی۔ ثروت کی طبیعت صبح سے بہت زیادہ پریشان تھی۔ اُس کی حرکات و سکنات سے ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہتی ہے پھر خود بخود رُک جاتی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک گھنٹے کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ہُوا۔ ذرا دیر چپ چاپ پڑی رہی پھر آنکھیں بند کرلیں۔ میں یہ سمجھی کہ آنکھ لگ گئی ہے۔ کیوں کہ پچھلی تمام رات اس کی نہایت کرب و اضطراب میں جاگتے بسر ہوئی تھی اور اُس کے پاس سے اُٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گئی۔ مشکل سے دس منٹ گزرے تھے کہ اُس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"عطیہ! ——— عطیہ!!"

میں بھاگتی ہوئی اس کے قریب گئی اور پوچھا "کیا بات ہے"؟ چند لمحوں کے سکوت کے بعد کہنے لگی "عطیہ! تم ایک مدت سے میری خدمت کر رہی ہو۔ خدا تم کو اس کا اجر دے ——— افسوس میں تمہارے کسی کام نہ آ سکی، تمہاری کچھ خدمت نہ کر سکی ——— خدمت تو رہی ایک طرف تمہاری معمولی سی خواہش کو آج تک پورا نہ کر سکی عطیہ! اب شاید میری زندگی کی چند ساعتیں باقی ہیں، میں چاہتی ہوں کہ آج تم پر وہ راز افشا کر دوں جس کے معلوم کرنے لئے تم اتنی زیادہ بے تاب تھیں ——— راز نہیں مصیبت کی کہانی ہے جو ———"

نقاہت کی وجہ سے آگے نہ کہہ سکی۔ میں نے خیال کیا کہ اس نازک وقت اس پُرغم قصہ کا دُہرانا ٹھیک نہیں۔ پچھلی رات سے اُس کا حال بگڑا ہُوا تھا، اس لئے میں نے کہا

ثروت یہ وقت اس قسم کی باتوں کا نہیں۔ اور تم اپنی زندگی سے مایوس کیوں ہو گئیں۔ کل تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ بہت کچھ آرام ہے۔ خدا کرے گا پانچ دس دن میں طبیعت درست ہو جائے گی پھر سُنا دینا۔"

"اب بالکل آرام ہو جائے گا عطیہ! اب بالکل آرام ہو جائے گا۔ میں اندھی نہیں۔ سب کچھ دیکھتی ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں میں کئی روز سے ورم آگیا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی بلکہ منتظر ہوں اُس مبارک گھڑی کی جب میں دُنیا کو بے وفا دنیا کو الوداع کہوں گی ——— خیر۔ ہاں یہ وقت واقعی ان باتوں کا نہیں۔ یہ وقت خدا کی یاد کا ہے اور دوسرے میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اس پُردرد کہانی کو سنا سکوں"۔

ثروت یہاں تک کہہ کر چھت کو تکنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور اضطراب کی کچھ انتہا نہ تھی۔ میں نے کہا۔

"ثروت! تم کیسی باتیں کرنے لگیں۔ خدا کے لئے اپنے دل سے اس خیال کو نکال دو۔"

ثروت رونے لگی اور روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ بیہوشی بھی ایسی ہوئی کہ میری کئی گھنٹے کی کوشش بھی اُسے ہوش میں نہ لا سکی۔ میں بہت زیادہ گھبرا گئی اور اُس کی والدہ کے پاس اطلاع بھیج دی۔ وہ فوراً ڈولی میں آ گئیں۔ ہم دونوں نے مل کر تدبیریں کیں مگر سب ناکام رہیں۔ آخر ڈاکٹر کو بلایا وہ بھی دو ایک پچکاریاں لگا کر چلتا بنا تیسرے پہر کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔ ہوش کا آنا تھا کہ مجھ میں جان آ گئی۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے کہا

"آج تو خوب سوتی رہیں آپ ایک بجے اٹھا رہے ہیں، اب اٹھی ہیں"۔ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتی رہی پھر اپنی والدہ سے کہنے لگی" امی جان! آپ کب آگئیں" کچھ سوچ کر مجھ سے کہا" میں تو تہیہ کر کے سوئی تھی کہ قیامت سے پہلے نہ اٹھوں گی مگر تم نے اٹھا ہی لیا"۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اپنی بیہوشی کو تاڑ گئی ہے اس لئے نیند کے ذکر ہی کو چھوڑ دیا۔

دن بھر اُس کا حال خراب رہا۔ بے چینی اور بے تابی کی کوئی حد نہ تھی۔ شام سے خویش و اقارب اُس کا حال دریافت کرنے آنے لگے۔ رشتہ دار عورتیں رات کے گیارہ بجے تک بیٹھی رہیں۔ ثروت کی طبیعت اُن کی باتوں اور اُن کے بچوں کے شور سے اور زیادہ گھبرانے لگی۔ میں نے بڑی خوشامدوں سے عورتوں کو سمجھایا انہوں نے بُرا محسوس تو ضرور کیا مگر اٹھ کر چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی میں نے ثروت کو دوا پلائی اُس کے قریب ایک چارپائی پر لیٹ گئی دو تین دن سے میں صرف دو ایک گھنٹے سو سکتی تھی۔ تھکی ماندی بھی تھی آنکھ لگ گئی۔ تین چار بجے جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ثروت بیٹھی ہوئی لکھ رہی ہے اور اُس کی والدہ اور بھائی بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ میں کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ اُس کا قلم اسی تیزی سے چلتا رہا۔ میں نے اٹھنا مناسب خیال نہ کیا۔ میں سمجھی کہ اُسی کو خط لکھ رہی ہو گی جس کی تصویر اُس کے پاس ہے۔ میں پھر سو گئی صبح کو اٹھی تو ثروت خلافِ معمول سوتی ملی۔ اس بیماری میں بھی وہ صبح گرتی پڑتی اٹھتی تھی مگر نماز کبھی قضا نہ کرتی تھی۔ میں نے اُس کی والدہ کو جگایا اور خود نماز پڑھ کر قرآن پڑھنے لگی میری آواز سن کر وہ بھی جاگ پڑی اور شاید نماز کے قضا ہونے کے خیال سے گھبرا کر یک لخت کھڑی ہو گئی۔ آہ طاقت نے ساتھ نہ دیا۔ چکرا کر گر پڑی۔ فرش میں سر لگا اور "امی جان" کہہ کر بیہوش ہو گئی۔ ادھر سے میں لپکی اور اُدھر سے اُس کی والدہ ——— ایسے بُرے وقت میں گری تھی کہ پھر ہوش میں نہ آئی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اُس نے پینے کی دوا دی، انجکشن کئے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ دوپہر تک بیہوش رہی اور اُس کے بعد ہم سب کو روتا چھوڑ کر اس مردار دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نزع کے وقت شاید پانچ سات لمحوں کے لئے ہوش آیا تھا۔ آنکھیں کھول کر چاروں طرف تکنے لگی۔ میں نے پوچھا "ثروت! اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ خاموش رہی جواب نہ پا کر میں نے پھر کہا "کس کی تلاش ہے؟" اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتی رہی جیسے پردیسی بے بسی برس رہی تھی اور معصومیت بھی۔ میں پھر بولی "ثروت ثروت!! بولتیں کیوں نہیں؟" آنکھیں بند کر کے اس نے زیر لب کچھ کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

ثروت کی جوانا مرگ سے جتنا صدمہ مجھے پہنچا شاید اس کی والدہ کو بھی نہ پہنچا ہو۔ میں پتھر بن کر رہ گئی۔ آنکھ ہی پھوٹے جو اس سے ایک آنسو بھی نکلا ہو اور زبان ہی گل جائے جو ایک آہ بھی کی ہو۔ نیم غشی کی حالت میں اس کے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ دیکھ سب کچھ رہی تھی مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اُس کی والدہ چارپائی کے قریب بیٹھ کر رونے لگیں بھائی سر پیٹنے لگے۔ پڑوس کی عورتیں بھی آگئیں اور آہ و زاریاں کرنے لگیں۔ ثروت کی والدہ اُن کی آہ و زاریاں سُن کر اور زیادہ

زار و قطار رونے لگیں۔ مگر میں جوں کی توں بیٹھی رہی۔ نظر سب کچھ آرہا تھا لیکن رو نہ سکتی تھی۔ حرکت نہ کر سکتی تھی بالکل بے بس تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر پہاڑ گر گیا ہے اور میرا جسم چکنا چور ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ساری طاقت کو جمع کر کے کھڑا ہونا چاہا ——— اس کے بعد کی مجھے خبر نہیں۔ سورج غروب ہونے سے تقریباً دو گھنٹے پہلے میری آنکھیں کھلیں کیا دیکھتی ہوں کہ سب عورتیں مجھے حلقہ میں لئے بیٹھی ہیں۔ فوراً سب باتیں یاد آگئیں۔ آہ۔ ثروت کو مٹی میں ملے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں اُس کی پیاری صورت کو آخری مرتبہ دیکھ بھی نہ سکی تھی ——— آہ میری عزیز ترین سہیلی آہ!

اتنے میں ثروت کی والدہ آئیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک لمبا سا کاغذ تھا۔ مجھے دے کر کہنے لگیں "لو۔ یہ ثروت کا خط ہے تمہارے نام" پہلے تو مجھے یقین نہ آیا۔ میں سمجھی کہ یونہی غم غلط کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ پھر جو کاغذ کو دیکھا تو ثروت ہی کی تحریر معلوم ہوئی۔ خط کا پڑھنا تھا کہ آنکھوں سے دو دریا اُمڈ آئے۔

ثروت نے لکھا تھا

"پیاری عطیہ! ثروت کا، اپنی ناشاد اور مجبور ثروت کا آخری سلام قبول کرو۔ میں غالباً آج رات کی اور مہمان ہوں۔ تم چار مہینے میرے ساتھ رہیں اور ان چار مہینوں میں مجھ سے جتنی ہمدردی تم نے کی کوئی عزیز ترین بہن بھی نہیں کر سکتی یہ تمہاری ہی رفاقت کے طفیل تھا کہ میں اتنا عرصہ زندہ رہی ورنہ کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی عطیہ! مجھے موت کا خوف نہیں مگر آہ تمہارے رنج و غم کا خیال کاٹے کھاتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھو مرتے وقت بھی اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ کاش میں بچپن ہی میں مرجاتی۔

تم میرا افسانۂ غم سننے کے لئے بہت بے تاب تھیں۔ مگر میں ہمیشہ ٹالتی رہی۔ کل میں نے خود سنانا چاہا مگر تم نہ مانیں صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں کوشش کروں گی کہ سب واقعات کو مختصراً لکھ دوں۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں مگر تمہارے پیہم اصرار کی وجہ سے قلم اٹھا رہی ہوں خدا کامیاب کرے۔ نقاہت مجبور کر رہی ہے کہ لیٹ جاؤں، ضعف زور دے رہا ہے کہ گر پڑوں، لیکن میں اپنی دُھن میں مست سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں

عطیہ! آخری وقت میں ان باتوں کو یاد کرنا جو میری اس بربادی کا باعث ہوئیں عقلمندی تو ہے نہیں، لیکن خواہ کچھ کہو اس وقت پانچ سال پہلے کا زمانہ فرحت و انبساط کا زمانہ، آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ دہلی کا مکان جنت نشان مکان، اپنی تمام مسرتوں کو جلو میں لئے میرے سامنے ہے۔ وہ وقت میری زندگی کا بہترین وقت تھا۔ احسان حسن و وفا کا پیکر احسان ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ والد اور والدہ کو رات کے وقت باتیں کرتے سنا تھا کہ وہ مجھے احسان کے ساتھ بیاہ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں میں نے خیال کیا کہ ہمیں وابستہ تو ہونا ہی ہے اور اس کے علاوہ ایک ساتھ رہنا، سہنا، اٹھنا بیٹھنا رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ بہت جلد محبت نے عشق

کا اور عشق نے جنون کا درجہ اختیار کر لیا۔ ہمیں باتیں کرنے کا وقت بہت کم ملتا تھا۔ اس لئے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پیاری پیاری تحریریں، محبت بھرے القاب، میٹھے میٹھے الفاظ کیا لکھوں اس کے خط پڑھ کر کیا مزا آتا تھا۔ یہ بات ایسی نہ تھی کہ مدت تک چھپی رہتی۔ آہستہ آہستہ میرے والدین کو بھی خبر ہو گئی۔ آہ۔ انہیں خبر ہونا ہی ہمارے حق میں زہر قاتل ہو گیا۔ جو باتیں محبت کی دنیا میں جائز ہیں اُن کی نگاہوں میں کھٹکنے لگیں۔ ہمیں آنکھیں ملتے پر مسکراتا دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ دو ایک دفعہ والدہ نے ہمیں خط لیتے دیتے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا شامت ہی آ گئی۔ مجھے بھی دھمکایا اور احسان کو بھی۔ اور بہت زیادہ دیکھ بھال کرنے لگے۔ احسان نے اُن کے ہر روز کے بدلے ہوئے تیور اور دن رات کے جھگڑے سے تنگ آ کر دوسری جگہ مکان لے لیا۔ کہاں ہر وقت کا ساتھ اور کہاں ہفتہ میں ایک بار ملاقات۔ یہ مصیبت مجھ سے اٹھائے نہ اٹھی۔

پیاری عطیہ! قصہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور میں مارے ضعف کے نڈھال ہو رہی ہوں۔ شاید سب باتیں نہ لکھی جا سکیں۔

اس کے بعد اور بہت سی مصیبتیں آئیں اور میں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے دو مرتبہ کوشش کی، دو مرتبہ زہر کھایا۔ مگر کم بخت موت کو بھی مجھ بدنصیب پر رحم نہ آیا۔ دونوں دفعہ طبی امداد نے مجھے کامیاب نہ ہونے دیا۔ احسان، آہ شہیدِ محبت احسان شادی کی آخری مرتبہ سر توڑ کوشش کر کے بے پتا ہو گیا۔ گو میرا دل کہتا ہے کہ احسان زندہ ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ مایوسی نے اسے کس حال کو پہنچا دیا ہے۔ خیر کچھ دیر میں میری روح اُس کے پاس پہنچ جائے گی۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں کہیں بھی ہے تمہاری ثروت کی یاد اُس کے دل میں ہے اور تمہاری ثروت کا سودا اُس کے سر میں عطیہ! میں نے اور احسان نے ایک زریں شام کو عہد کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احسان اب تک اس عہد پر قائم ہے اور جیتے جی قائم رہے گا اور میں، میں نے انتہائی کوشش کی۔ آہ! بے بس کیا اور بے بس کی کوشش کیا!ــــــ یہ بھی بجائے خود ایک طویل قصہ ہے۔

دل کی حرکت لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ چند لمحوں ہی میں بلیوں اچھلنے لگا ہے۔ طبیعت پر سخت پریشانی چھا رہی ہے اور دماغ پر ایک عجیب قسم کا بار محسوس ہو رہا ہے۔ آہ سچی محبت کبھی بار آور نہیں ہوتی۔ خبر نہیں خدا کیوں اس میں خوش ہوتا ہے کہ سچی محبت کرنے والے برباد ہوں، مٹ جائیں لیکن رہیں ناکام ہی۔ عطیہ میں نے بڑی کافی کوشش کی۔ والدہ ــــ بالکل صاف صاف بھی کہا اور لکھ کر بھی دیا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

عطیہ! اب مجھ سے بالکل نہیں بیٹھا جاتا۔ سر بہت ہی زیادہ گھومنے لگا۔ ہر چیز گھومتی نظر آ رہی ہے۔ اب ایک عجیب تاریکی تسلط کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ لیمپ بھی تاریک نظر آنے لگا ہے۔ اچھا رخصت!"

میں نے خط کو کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ دل کو پہلو سے زیادہ رنج پہنچا۔ آہ ثروت۔ دوسروں کی جہالت کا

شکار ہو کر یوں خاک میں مل گئی، یوں برباد ہو گئی۔ ثروت جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی شاید صدی میں ایک ہی دفعہ پیدا ہوتی ہو۔

اب میری کیا حالت ہے اس کی مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی نہیں رہا جو خوشی اور غم کو محسوس کر سکے۔ اور نہ کوئی آرزو۔ ایک آرزو ہے بھی ——— موت کی ——— کاش میں ثروت کے ساتھ مر جاتی۔ کاش میں ثروت کے ہمراہ سفر کر سکتی، کاش ہم ایک ساتھ اس دنیا سے، اس رنج وغم کی دنیا سے رخصت ہوتے۔ ثروت کے بعد میری زندگی بالکل بے لطف ہو گئی ہے۔ ثروت کیا گئی میری خوشی کو اور صرف میری ہی کیا تمام دنیا کی خوشی کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔ جسے دیکھو وہی غمگین نظر آتا ہے۔ جسے دیکھو اسی کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ در و دیوار سے حسرت و مایوسی برستی معلوم ہوتی ہے۔ خبر نہیں ثروت کے بعد کیوں سارے زمانے میں رنج، حسرت، حرماں نصیبی اور مایوسی مستولی ہو گئی اور نہ جانے کس لئے ثروت کے جاتے ہی تمام عالم سے مسرت وراحت یک لخت رخصت ہو گئی۔

ظفر واسطی شاہ آبادی

خوشی دنیا کے کونے کونے سے لپکی میرے جسم کی ساخت کے لئے۔

آسمان کی روشنیوں نے اُسے بوسے پر بوسہ دیا یہاں تک کہ وہ جاگ اٹھا

تیز رو بہاروں کے پھولوں نے اُس کے سانس میں آہیں بھریں اور ہواؤں اور پانی کی آوازوں نے اُس کی جنبشوں میں گانا گایا

بادلوں اور جنگلوں کے رنگوں کی لہروں کا جذبہ اس کی زندگی میں بہ نکلا اور تمام اشیا کی موسیقی نے اس کے اعضا سے لپٹ کر اُسے سانچے میں ڈھالا

وہ ہے میرا محبوب ——— وہ جس نے اپنا دیا میرے گھر میں روشن کیا ہے۔

لڑکیاں جس سے دل لگی کرتی ہیں اس سے شادی نہیں کرتیں

اچھی شادی آدمی کے لئے پر پرواز ہے بُری شادی زنجیر پا۔

گلچیں

خزاں

ابھی یہ بات ہی کل کی کہ آرہی تھی بہار
نویدِ عیش چمن کو سنا رہی تھی بہار
بدل رہے تھے لباس اپنا شاہدانِ چمن
غریقِ زینت و تزئیں تھے گل رُخانِ چمن
لدی ہوئی تھی ہوا عطر بیزیٔ گل سے
فضا میں کیف بھرا تھا نوائے بلبل سے

مگر زمانہ نے یک لخت ایسی کروٹ لی
نہ وہ بہار تھی باقی نہ اُس کی رعنائی
وہ ظلم و جور ہوئے ہیں خزاں کے ہاتھوں سے
اجڑ گیا ہی چمن آسماں کے ہاتھوں سے
تاثراتِ خزاں کی جھلک ہے ہر شے میں
نہ لوچ نغمہ میں باقی نہ کیفیت مے میں
تمام باغ میں اک زرد پھول باقی ہے
بس ایک جانِ فگار و ملول باقی ہے

یونہی ازل ہی بہار و خزاں کے ہیں ادوار
یہی ہیں گردشِ لیل و نہار کے اطوار
تو کیوں ملول ہے آ دوست اے بہار پسند
ستم ظریفِ زمانہ نہیں قرار پسند

جو زندگی ہے تو پھر بھی بہار آئے گی
بہار آئے گی اور بار بار آئے گی

ناظر اوجلوی

اصلاحِ ادب

(۵)

به سلسلۂ اشاعت اکتوبر ۱۹۳۲ء

نثر

فقرہ۔ پرسوں بدھ وار کے دن سکول میں چھٹی ہوگی۔

اصلاح۔ پرسوں بدھ کے دن (یا بدھ کو) سکول میں چھٹی ہوگی۔

وجہ۔ "بدھ وار کے دن" غلط ہے کیونکہ "وار" کے معنی "دن" کے ہیں۔ اسی طرح "لیلۃ القدر کی رات" اور "کوئی ایک فردِ واحد" وغیرہ بھی غلط ہیں۔

فقرہ۔ یہ عجوبہ نظارہ تو ہم نے آج ہی دیکھا۔

اصلاح۔ یہ اعجوبہ نظارہ تو ہم نے آج ہی دیکھا۔

وجہ۔ "عجوبہ" کوئی لفظ نہیں۔ البتہ "اعجوبہ" درست ہے۔

فقرہ۔ عورتیں منہ ڈھانک کر روتی ہیں۔

اصلاح۔ عورتیں منہ ڈھانپ کر روتی ہیں۔

وجہ۔ یہ ڈھانپنے کا محل ہے۔ واضح ہو کہ "ڈھانپنا" غم کے لئے مخصوص ہے۔ اور "ڈھانکنا" چھپانے کے لئے

فقرہ۔ انہوں نے مشاعرہ میں یہ شعر سہ کرر پڑھا تھا۔

اصلاح۔ انہوں نے مشاعرے میں یہ شعر تین مرتبہ پڑھا تھا۔

وجہ۔ (۱) "مشاعرہ" کے آگے حرفِ جار (میں) آجانے کے باعث "ہ" "ے" سے بدل جائے گی۔

(۲) سہ کرر کوئی لفظ نہیں۔ "مکرر" کا مادہ "کر" ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو بار بار کرنا۔ پھیر دینا۔ ہٹا دینا۔ دشمن پر حملہ کرنا۔ لیکن "کر" بمعنی "دفعہ" بالکل غلط ہے۔

فقرہ۔ مجھے اس کاروبار میں شراکت منظور نہیں۔

اصلاح۔ مجھے اس کاروبار میں شرکت منظور نہیں۔

وجہ۔ "شراکت" کوئی لفظ نہیں۔ اس کی جگہ "شرکت" استعمال کرنا چاہئے۔
فقرہ۔ محمود اپنی جماعت میں اول رہا۔ اور حمید دوئم۔
اصلاح۔ محمود اپنی جماعت میں اول رہا اور حمید دوم۔
وجہ۔ "دو" کا صفتِ عددی ترتیبی دوم ہے۔ دوئم نہیں۔ اسی طرح سوئم بھی غلط ہے۔

نظم

شعر۔ اگر دیکھا نظر بھر کے تو مر ہی جاؤں گا ظالم — تری آنکھیں نہیں ہیں زہر کے لبریز پیالے ہیں
اصلاح۔ اگر دیکھا نظر بھر کے تو مر ہی جاؤں گا ظالم — تری آنکھیں کہاں ہیں زہرِ قاتل کے پیالے ہیں
وجہ (۱) "نہیں" کے بعد "ہیں" حشو ہے۔ "کہاں" سے مصرع کا زور بھی بڑھ گیا۔
(۲) "پیالہ" فارسی لفظ ہے۔ لہذا "یا" کا اخفا غلط ہے۔ اعلان چاہئے۔
شعر۔ صہبائے کیف آور دو روزہ زندگی ہے — ترشی چکھی قضا کی اترا خمارِ ہستی!
اصلاح۔ صہبائے کیف آور دو روزہ زندگی ہے — چکھی قضا کی تُرشی اُترا خمارِ ہستی
وجہ۔ "چکھی" اور "رکھی" بتشدید صحیح و فصیح ہیں۔
مصرع۔ مری عید الضحیٰ محبوب پر قربان ہونا ہے۔
اصلاح۔ ہماری عیدِ قُرباں دوست پر قُربان ہونا ہے۔
وجہ۔ "عید الضحیٰ" عربی قواعد کے رُو سے غلط ہے۔ اس کی جگہ "عید الاضحیٰ" یا "عید اضحیٰ" استعمال کرنا چاہئے۔ مگر یہاں یہ دونوں صحیح لفظ شعریت سے خالی ہیں۔
شعر۔ یہ کہہ کے رو دئے وہ ہمارے مزار پر — کیا میرے مرنے والے کی میّت اسی میں ہے
اس غزل میں "اسی میں ہے" ردیف ہے اور "صورت" "محبت" وغیرہ قافیہ
غلطی۔ "مَیّت" بکسر یاء مشدّد ہے۔ لہذا قافیہ غلط ہے۔
شعر۔ گُل نفس سے یہ بے ساختہ پن یاد آیا — جب قبا پہنی گریبانِ کفن یاد آیا
غلطی۔ "بے ساختہ پن" کا محل استعمال صحیح نہیں۔ "پن" محض قافیے کی رعایت سے لایا گیا ہے۔

نشتر جالندھری

قطبی اور بی بی

طالبانِ علم تا تحصیلِ علم ‏ ‏ ‏ گھر کے دھندوں سے نہ رکھیں کوئی کام

ذکر بھی شادی کا چھڑ جائے اگر ‏ ‏ ‏ ہے مناسب وہ کریں قطعِ کلام

کہتے ہیں اک شخص کی تعلیم کا ‏ ‏ ‏ سلسلہ ہونے نہ پایا تھا تمام

کر دیا ماں باپ نے خود اُس کا عقد ‏ ‏ ‏ زلیست جس سی ہوگئی اُس پر حرام

تھا وہ مصروفِ کتب بینی جہاں ‏ ‏ ‏ تھی وہیں نالاں عروسِ تشنہ کام

تنگ آکر ایک شب کہنے لگی ‏ ‏ ‏ اس نگوڑی کا مجھے بتلاؤ نام

بولا شوہر کہتے ہیں قطبی اُسے ‏ ‏ ‏ منطقی کی جان ہے یہ لا کلام

بولی وہ جھنجلا کے ہے یہ میری سوت ‏ ‏ ‏ ظلم کا میں اس سے لوں گی انتقام

واسطہ بی بی سے رکھنا ہے اگر ‏ ‏ ‏ بھول کر بھی تم نہ لو قطبی کا نام

اور اگر قطبی کی الفت دل میں ہے

لیجئے سرکار! بی بی کا سلام

سید علی منظور
حیدرآبادی

محفلِ ادب

زہرہ کے بُندے

(ایک ہسپانوی گیت کا ترجمہ)

ابوالحارث کی بیٹی زہرہ غرناطہ میں ایک فوّارے کے پاس کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے:۔

"ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے کنویں میں گر گئے۔ ہائے اب میں کیا کروں گی موسیٰ سے کیا کہوں گی! کنواں بہت گہرا ہے۔ میرے بندے اس کے سرد نیلگوں پانی کی گہرائی میں پہنچ چکے۔ یہ بندے مجھے مُوسےٰ نے اُس وقت دئے تھے جب وہ مجھ سے آخری مرتبہ رخصت ہو رہا تھا۔

آہ! جب وہ واپس آئے گا۔ میں اس سے کیا کہوں گی!

ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے۔ موتیوں کے بنے ہوئے۔ چاندی میں جڑے ہوئے میرے موسےٰ نے مجھے اس لئے دئے تھے کہ جب تک وہ دور دراز تونس میں مجھ سے جدا ہے میں اس کو۔ صرف اسی کو والہانہ یاد کرتی رہوں۔ نہ کسی غیر کی زبان سے کوئی بات سنوں نہ کسی غیر کی بات چیت پر مسکراؤں۔ ہر وقت یاد رکھوں کہ موسےٰ نے میرے ان اچھوتے ہونٹوں کو چوما تھا: جو میرے گوہریں بندوں کی طرح پاکیزہ ہیں۔

آہ! جب وہ واپس آئے گا اور سُنے گا کہ وہ بندے میں نے کنویں میں گرا دئے وہ مجھے کیا سمجھے گا۔ میرے متعلق کیا خیال کرے گا۔ آہ! میں اس سے کیا کہوں گی؟

ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے! موسیٰ کہے گا۔ کاش وہ بندے موتی اور چاندی کی جگہ سونے کے بنے ہوئے ہوتے۔ کاش ان میں زبرجد اور نیلم کا رنگ ہوتا۔ ان میں الماس کی درخشانی ہوتی۔ جو روشنی کے ہر تغیر کے ساتھ اپنا رنگ بدل لیتی ہے۔ ان کی آب و تاب نا پائیدار

اور بے وفا ہوتی کیوں کہ بے وفاؤں کے لئے مستقل چمک دمک رکھنے والے جواہر موزوں نہیں ہیں۔
آہ! جب موسیٰ اس طرح خیال کرے گا۔ میں اس سے کیا کہوں گی!

وہ خیال کرے گا زہرہ بازار گئی ہوگی اور رستے میں کسی جگہ کھڑی ہوگئی ہوگی۔
وہ خیال کرے گا زہرہ نے آوارہ مزاج نوجوانوں کی باتیں دلی خواہش سے سنی ہوں گی۔
وہ خیال کرے گا کہ کسی اور عاشق کا دستِ شوق میرے گیسوؤں کے پیچ و خم میں الجھا ہوگا اور اس حالت میں موتیوں کی وہ لڑیاں جو میرے کانوں میں موسیٰ نے اپنے ہاتھ سے ڈالی تھیں کھل گئی ہوں گی۔
وہ خیال کرے گا جب زہرہ سنگِ مرمر کے کنویں کے پاس اس طرح رنگ رلیاں منا رہی ہوگی۔ اس کے کانوں کے بندے کنوئیں میں گر گئے ہوں گے۔
ہائے میرے اللہ میں اس سے کیا کہوں گی۔

وہ کہے گا۔ زہرہ عورت ہے اور عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔
وہ کہے گا۔ جب یہاں میری محبت کا شعلہ روشن تھا۔ زہرہ اس شعلے سے گرما رہی تھی۔ لیکن جب میں تونس چلا گیا۔ زہرہ کی "دوشیزہ وفا" لوٹ گئی۔ اس نے میرا خیال چھوڑ دیا۔ وہ میری نشانی سے بے پروا ہوگئی۔
ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے! آہ! اے منحوس کنویں! تو نے یہ کیا ستم کیا۔ اب میں موسیٰ سے کیا کہوں گی۔

میں موسیٰ سے سچ سچ کہہ دوں گی۔ وہ میری بات پر اعتبار کرے گا۔ میں اس سے کہوں گی پیارے موسیٰ۔ میں صبح بھی تجھی کو یاد کیا کرتی تھی۔ میں شام کو بھی تیرے ہی خیال میں غرق ہوتی تھی۔ ایک دن شام کے وقت میں تیری یاد میں محو تھی۔ آفتاب مغرب کے افق میں ڈوب چکا تھا تیرے بندے میرے ہاتھ میں تھے۔ میں فوارے کے پاس اکیلی اور اداس کھڑی تھی۔ میرا دل دور ـــــ سمندر کی لہروں پر بہا جا رہا تھا۔ میں بیخود ہوگئی۔ بندے میرے ہاتھ سے گر گئے۔

لیکن یقین رکھ۔ تیرا عشق میرے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح آرام کر رہا ہے۔ جس طرح تیرے بندے کنوئیں کی گہرائی میں پوشیدہ ہیں۔ "کارروان"

ہندوستان کا ایک نقش

ذیل کا مضمون علیاحضرت سلطانہ درشہوار (بیگم شہزادۂ ولی عہد بہادر مملکت آصفیہ) نے گزشتہ سفر یورپ کے زمانہ میں بزبان انگریزی تحریر فرمایا اور سوئٹسان (سویزرلینڈ) کے مشہور جریدہ داوسر ریویو میں چھپا تھا۔ علیاحضرت کی اجازت سے اس کا اردو ترجمہ رسالہ معارف کے واسطے حاصل کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس جلیل القدر ترک شہزادی کے پاکیزہ مذاق اور افکار عالیہ سے آگہی کا موقع ملے اور وہ یہ بھی اندازہ کرسکیں کہ اس عالی دماغ و عالی نژاد سلطانہ کو اپنے نئے وطن (ہندوستان) سے کس درجہ محبت اور دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔

سرزمین ہندوستان ہر شخص کی خیال آفرینی کو تحریک میں لے آتی ہے۔ اپنی اصلیت کے سوا وہ ہر حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ مجسم داستان پریوں کی کہانی یا خواب ہے۔ جسے انسانی دماغ فرصت کے وقت بہتر سے بہتر بناتا رہتا ہے وہ ایک ملک ہے جسے مغربی تصور نے حیرت انگیز اور بے جان طلسم کی صورت بخشی ہے۔ اس کا وجود تو ہے مگر زندگی نہیں؟ لفظ ہندوستان میں آہنگ ہے مگر معنویت نہیں سرسبزی ہے مگر گہرائی نہیں اسے چند خصوصیتیں ضرور حاصل ہیں وہاں گاندھی نے جنم لیا۔ وہاں سانپ رہتے ہیں۔ شیروں کا شکار ہوتا ہے اور زیور پہنے ہوئے راجاؤں کو ہاتھی لئے لئے پھرتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، ہندوستان کے بارے میں اس طلسم کو توڑنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی خوبیاں نظر انداز ہوجائیں، میں چاہتی ہوں کہ ان افسانوں سے الگ کرکے اس کی اصل تصویر دکھادوں۔

ہندوستان محض نام نہیں بلکہ زندگی بھی رکھتا ہے۔ اس میں رنگینی ہے شاعری ہے اور رفتہ رفتہ ذار پر بہار لاینحل ماضی ہے جو صرف مشرقی ممالک ہی اپنے اندر رکھ سکتے ہیں یہاں گزشتہ زمانے کی نشانیاں نہیں مٹتیں نہ ان میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یورپ میں قدیم عمارات ایک خاص عہد کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں لیکن مشرق میں اس قسم کے نمونے گویا بنانے والوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں اس آدمی کا کردار، عزم، قوت، زندگی، سلیقہ، نفاست پسندی اور بطون تک نظر آجاتا ہے جس نے ان کو بنایا ہے۔ مذہبی عمارتوں خصوصاً مندروں کو چھوڑ کر (جن کی قدر و قیمت بلحاظ فن معماری کچھ کم نہیں) وہ نہ صرف ایک عہد کو بتاتی ہیں بلکہ اپنے بنانے والوں کی یاد کو بھی قائم رکھتی ہیں۔ مشہور و معروف تاج محل کو دیکھنے سے عام مسافر کو ایک بڑھتے آدمی کی محبت اور عالی رتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک صاحب نظر کے آگے بنانے والے کے اندرونی خیالات تک افشا ہوجاتے ہیں۔ روضے کا ناقابل بیان سکون اور عظمت کی شان سلاطین گزشتہ کی فانی زندگی

کو ایک حد تک ضرور لافانی بنا دیتی ہے۔ ایک دن ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ روضہ ان کی نظر میں نہیں جچا اور انہیں شکایت تھی کہ اس میں جذبات زیادہ بھرے ہیں لیکن ایسی چیز میں جذبات کی انتہا کیوں کر ہو سکتی ہے جو ایک محبت صادق کی یادگار ہو؟

قلعۂ دہلی اور اسی طرح قلعۂ آگرہ بھی معماری کا نفیس ترین نمونہ ہیں اور ان کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن تعمیر کے عجائبات سے ہیں۔ یہ وہ نیم ربانی آثار ہیں کہ نگاہ سے بڑھ کر دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسی پر اُمن پسندیدہ اور ناقابل بیان چیز ہے جو ہر دیکھنے والے میں اختلافِ ذوق کے باوجود وجد پیدا کر دیتی ہے، دیوانِ خاص کی مشرقی وضع کی کمانوں سے خاموش فواروں اور لمبے دالان سے (جس کے دریچے میں پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کا رنگ اڑ گیا ہے) ایک عظمت کی شان پیدا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے بڑے تاجدار شاہجہان کے حضور میں باریاب ہیں اور اس کا عہدِ حکومت خاموشی کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سے گزر رہا ہے

یورپ کے آثارِ قدیمہ کے برخلاف ایشیائی عمارتیں آرائش و تجمل کے مٹ جانے کے بعد بھی ایسی ویران و سوگوار نہیں ہو جاتیں، جیسا کہ مثلاً لاقصر وارسٹی ہے کہ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کا یہ باعظمت و وقار محل بہت پیشتر اپنے عروج کی منزل طے کر چکا، اور اگرچہ فوارے اب بھی اپنا راگ الاپ رہے ہیں اور گزشتہ زمانے کا منہ چڑا رہے ہیں۔ لیکن وہ زمانہ نسیاً منسیاً ہو چکا۔ میں نے مشرق میں ایسی حالت نہیں دیکھی۔ گو عمارتیں خاموش کھڑی ہیں لیکن یہ خاموشی ایک چیستان ہے، موت نہیں ہے۔ جب میں قلعۂ دہلی میں داخل ہوئی تو مجھے محسوس ہُوا کہ میں بالکل ایک دوسری دنیا میں آ گئی ہوں۔ باغ بہت عمدہ حالت میں رکھا گیا ہے جس طرح سابق میں ہوگا۔ اور دیوانِ خاص میں (جس کا ذکر ابھی کیا) آنے سے پہلے ایک چھوٹی سی مسجد ملتی ہے۔ جسے موتی مسجد کہتے ہیں۔ یہ مسجد اردگرد کی روئیدگی میں فی الواقع ایک گوہرِ درخشاں ہے اور اس کے اندر اس مذہب کی پاکیزگی اور امن کا جلوہ نظر آتا ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔

یہ اور اسی قسم کی کئی عمارتیں ایسی ہیں کہ ہر ایک کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ الورا اور اجنٹا کے غار جو حیدر آباد سے قریب ہیں نہ صرف معماری بلکہ نقاشی کے لحاظ سے قدیم زمانے کی نایاب یادگار ہیں۔ جن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی طرح گولکنڈہ کے شاہی گنبد، بیجاپور کی جامع مسجد اور ابراہیم کا روضہ، سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ، دہلی کی جامع مسجد، لکھنؤ کا بڑا امام باڑہ، گوالیار میں محمد غوث کا مقبرہ، فتح پور سیکری میں اکبر اور عیسیٰ خاں کے مقبرے ارچھا، بیسور جے پور کے شاہی محل، اجمیر کی مسجد، حیدر آباد کی جامع مسجد، سری رنگا پٹم کی علا مسجد، لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ، رامیشورم اور مدورا کے بڑے مندر، سری رنگم میں جمبو کیشورا کا دیول، قلعۂ گوالیار اور چتوڑ گڑھ کا سربلند مینار، کوہ آبو، کا نیم ناتھ مندر، پٹنہ میں جینیوں کا مندر، سکھوں کا سنہری گردوارہ وغیرہ

وغیرہ نایاب عمارتیں ہیں۔ گویا صرف جواہرات، یاقوت الماس موتی ہی ہندوستان کی دولت نہیں بلکہ فنِ معماری سے متعلق اشکال، خاکے اور خطوط کے بے بہا خزانے بھی یہاں بکھرے پڑے ہیں،

ہندوستان کی ایک اور حیرت انگیز زندہ یادگار اس کا رنگ ہے۔ ہندوستان کی بیٹیاں اس فن میں فطری دستگاہ رکھتی ہیں۔ بازار میں، گاؤں میں، باولی پر وہ مختلف رنگوں میں نظر آتی ہیں۔ ان کے سرخی مائل جسم پر شوخ نارنجی یا ہلکا گلابی یا گہرے سُرخ رنگ کا جوڑا ہوتا ہے۔ کسی قدر دور کیوں نہ ہوں وہ پہچان لی جاتی ہیں پہلے اس بھڑکیلے رنگ پر نگاہ پڑتی ہے۔ اور وہیں ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے۔ لپٹے ہوئے کپڑے میں سے جو اکثر پھٹا اور پیوند لگا ہؤا ہوتا ہے دو کا سے کے رنگ میں پاؤں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ہر حرکت میں ایک فطری موسیقی پوشیدہ ہے۔ سر پر جس کے پیچھے سیاہ بالوں کا جوڑا بندھا ہوتا ہے۔ پانی کا برتن رہتا ہے اس کو وہ ایک ہاتھ سے تھامتی ہے اور دوسرا ہاتھ برابر وقفے سے حرکت کرتا ہے۔ اس عورت میں جو باوجود غیر تعلیم یافتہ ہونے کے رنگ شناسی کے فن میں خداداد مہارت رکھتی ہے۔ سب سے حیرت انگیز چیز اس کی چال ہے۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی کیوں نہ ہو اس کی رفتار شاہانہ ہوتی ہے۔ اس کی باقاعدہ رفتار اس کی دوسری اقوام کی بہنوں کو متحیر کرتی ہے۔ اس میں ناقابلِ بیان خوبصورتی اور بے پایاں توازن اور غرور نظر آتا ہے۔

اس غرور کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور چونکہ اس میں تصنّع کا شائبہ نہیں۔ اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کی بنا کیا ہے۔ البتہ خوبصورتی اور توازن کی وجہ ان کی موسیقی سے محبّت ہے، یہ محبّت آواز کی فریفتگی سے ہے نہیں جو صرف کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ یہ اس قوم کی ذاتی اور امتیازی صفت ہے جو یہاں کے جاہل سے جاہل میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں اور یورپ کی موسیقی میں کوئی مناسبت نہیں۔ جن کے کان یورپ کی موسیقی سے آشنا ہوں، ان کے سامنے اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک طویل راگ ہے۔ یہ راگ پہلے پہل تو ایک ہی طرز کا معلوم ہوتا ہے۔ جو اجنبی سامع کو ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد وہ اپنے سحر سے تسخیر کرتا اور سننے والے کو مست بنا دیتا ہے، اور پھر وہ سمجھنے لگتا ہے۔ کہ یہ راگ پوشیدہ اور مخفی طور پر قوم کی تصویر کھینچ رہا ہے۔ اس کی یکساں سامعہ نوازی ایک ایسی سرزمین کو ظاہر کرتی ہے جس سے مغربی اقوام نابلد ہیں۔ ماضی وحال کے بہترین لکھنے والوں کی شاعری کا سرمایہ پاٹ دار برمانے والی آواز اور بعض اوقات بول، یہ تمام چیزیں ان لوگوں کی حالت بیان کرتی ہیں۔ اگرچہ مذہب فرقے اور رسم ورواج کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ موسیقی اور وہ زبین جوان کا مرزبوم ہے۔ انہیں آپس میں متحد کئے ہوئے ہے۔ یہ موسیقی گو سمجھ میں نہ آئے، اپنا اثر کئے

بغیر نہیں رہ سکتی۔ الفاظ بیں ہر شاعر کا اپنا فلسفہ اور طریقۂ بیان الگ ہے۔ لیکن سب کے لب ولہجہ میں گہرا تصوف مضمر ہے۔ جو وضاحت سے بالاتر ہے۔

یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ ملکِ ہندوستان قدیم وجدید حقیقت اور افسانہ، عظمت رفتہ اور جدید ترقی کا سنگم ہے۔ میرے اس مختصر بیان سے ناظرین کے ذہن میں صرف جگمگاہٹ رنگ، حیرت انگیز عمارات اور شاندار ماضی کا (جس کی دلکشی ہنوز باقی ہے) تصور قائم ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک چیز اس ملک اور اس کے مذکورہ بالا تصور سے الگ بھی ہے اور وہ جدید ترقی ہے۔ بغیر دیکھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قدر نئی ایجادات واختراعات سے اس ملک نے استفادہ کیا اور کس حد تک اس ملک کے باشندوں نے انہیں قبول کرلیا ہے۔ بڑے شہروں میں بہترین جدید سڑکیں، عمارتیں، دکانیں، آئین وعادات نظر آئیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ رنگ بھڑک اور نظر فریبی بھی جو ایک مشرقی ملک کا حصہ ہے۔ مدارس دواخانے اور دارالمطالعے بھی موجود ہیں۔ حیدرآباد کا محبوبیہ گرل اسکول اپنی قسم کا بہترین مدرسہ ہے۔ جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ملک میں اس قدر سختی سے پردہ ہونے کے باوجود یہ کس طرح قائم ہے۔ ہندوستان کا ایک بڑا دارالمطالعہ بھی حیدرآباد میں ہے۔ جو نہایت خوش اسلوبی اور انتظام کے ساتھ چلایا جا رہا ہے +

اسی طرح اور بہت سے اُمور ہیں لیکن میں یہاں صرف اس قدر اضافہ کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتی ہوں کہ مجھے اپنے ملک پر ناز ہے جو یقیناً تنوّع کے وصف سے مالامال ہے۔ اگر زمانے کی تیز رفتار ترقی سے طبیعت گھبرا جائے تو دماغ کو آرام دینے کے لئے عہدِ رفتہ کے آثار موجود ہیں۔ میں نے ابھی تو اس طلسمات میں قدم رکھا ہے اور یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اس کے اسرار کو حل کرنے کے لئے مجھے کتنی عمر صرف کرنی ہوگی +

"معارف"

تصحیح

فروری کے پرچے میں پروفیسر فیاض محمود کے مضمون میں ایک غلطی رہ گئی ہے ناظرین اس کی تصحیح کر لیں۔ صفحہ ۱۹۰ کی پہلی سطریوں ہے:۔ مگر دنیا میں ایسے ناولسٹ بھی ہیں جن کی تصانیف میں زندگی کی سی وسعت پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ٹالسٹائے .... الخ

شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد

انشاء اللہ تین ہفتے کے اندر اندر شائع ہو جائے گی

نہایت مسرت سے اعلان کیا جاتا ہے کہ شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد اللہ کے فضل و کرم سے تکمیل پا چکی ہے اور اس وقت لاہور کے ایک مطبع میں پہلی جلد سے بھی زیادہ آب و تاب کے ساتھ طباعت پذیر ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس ماہ کے اندر شائع ہو جائے گی۔

جنگ بدر جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں صرف تین سو تیرہ نہتے اور بے سر و سامان مجاہدین اسلام نے مشرکین مکہ کی جرار فوج کے زبردست حملے کا مقابلہ کیا اور صرف جوش ایمانی سے کام لیکر دشمنوں کو شکست فاش دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح مشرک قیدیوں پر احسان فرمائے مدینے میں منافقین اور یہود کی شرارتیں مسلمانوں کا صبر و تحمل کعب بن اشرف یہودی ہجوگو شاعر کا انجام

مکے میں مشرکین کا جوش و خروش اور انتقامی جنگ کی تیاریاں۔ ابوسفیان کا مدینے پر چھاپا۔ غزوۂ سویق۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کی سادہ تقریب۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا جہیز۔

مشرکین مکہ کا ابوسفیان کی ماتحتی میں مدینے پر تباہ کن حملہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا مدافعت کے لئے مدینے سے نکلنا۔ منافقین کی جماعت کا عین وقت پر فوج اسلام سے الگ ہو جانا۔ صحابۂ کرامؓ کا ثبات و استقلال۔ تیر اندازوں کی غلطی کے سبب جنگ مغلوبہ میں مسلمانوں کی فتح کا شکست سے بدل جانا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محیر العقول ثبات اور صحابہ کی جان نثاریاں۔ آنحضرت کا زخمی ہونا۔ مشرکین مکہ کا بے نیل مرادم واپس لوٹنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ اسلامی کے یہ سب حالات نہایت واضح اور آسان اردو میں اس طرح نظم کر دئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے قوم کی افسردگی اور بے چینی دور ہو سکتا ہے۔ جن حضرات نے پہلی جلد کا مطالعہ کیا ہے اگر وہ دوسری جلد کا بھی اشتیاق رکھتے ہوں تو جلد از جلد فرمائش بھیج دیں۔ یہ جلد بھی پہلی جلد کی طرح دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے کتابت طباعت اور کاغذ پہلی جلد سے بھی بہتر ہے تقطیع اور ضخامت بھی وہی ہے اور قیمت بھی وہی ہے یعنی تین روپے فی جلد علاوہ محصول ڈاک

(نوٹ) تین روپے فی جلد والے ایڈیشن کے علاوہ اس جلد کا بھی ایک خاص ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ایڈیشن محدود ہو گا یعنی صرف ۵۰ کتابیں چھاپی گئی ہیں۔ یہ مجلا اور مطلا اور مذہب ہو گا۔ بالکل جلد اول کے خاص ایڈیشن کی طرح۔ اس کی قیمت فی جلد ساڑھے بارہ روپے ہو گی۔ اس کا کاغذ تین روپے والی جلد سے مختلف اور بڑھیا ہے +

جن حضرات نے پہلی جلد کا خاص ایڈیشن منگایا تھا وہ بھی جلد فرمائش ارسال کریں تین روپے والی جلد غیر مجلد ہے۔

ملنے کا پتہ :- **کتب خانہ شاہنامۂ اسلام۔ انار کلی۔ لاہور**

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا
صرف سرورق اور تصاویر روکوٹر یہ آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپیں۔

قواعد

مستعار از سہ ماہی ادبی صحیفہ

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم چونسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۳ر (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶ر

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔اے

فہرستِ مضامین





"ہمایوں" بابت ماہِ اپریل ۱۹۳۳ء

تصاویر:-

(۱) لال باغ بنگلور (۲) اوٹی کے نشیب و فراز

(۳) ٹوڈوں کی بستی میں (۴) ٹوڈوں کا سلام

قیمت فی پرچہ ۶/ دیلر بک سٹال پر ۸/ چندہ سالانہ للعہ مع محصول

طلسمِ زندگی

روزنامۂ "زمیندار" کی رائے

"زیرِ نظر کتاب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لاء مدیر ہمایوں کی پندرہ سال کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے اس کے ظاہری حسن و آرائش کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے۔ اردو زبان میں اس اہتمام سے شاید ہی کوئی ادبی کتاب شائع ہوئی ہو۔ اس میں اکیس رنگین بلاک ہیں اور تمام کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے سرورق اور جلد بے انتہا نفیس اور تصاویر نمایاں طور پر خوبصورت ہیں۔

"طلسمِ زندگی" چھ ابواب میں تقسیم ہے اور ہر باب کا آغاز ایک ہفت رنگ منقش صفحہ سے ہوتا ہے جو قدیم اسلامی نقاشی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ چھ ابواب کی تقسیم حسبِ ذیل عنوانات میں ہوئی ہے (۱) مناظر (۲) صدائے روح (۳) آئینۂ دل (۴) وجد و جد (۵) سرگوشیاں (۶) خیالات پریشاں۔

ان ابواب میں حسنِ فطرت، اخلاق، تصوف، کشمکش نفس اور محبت کے پاکیزہ جذبات کا ایک انوکھے رنگ میں اظہار کیا گیا ہے۔ مصنف کا اندازِ بیان پسندیدہ اور زبان لطیف و سلیس ہے۔ جذبات اور اندازِ اظہار کے پیشِ نظر یہ مختلف مضامین گویا دلاویز منثور نظمیں ہیں۔

کتاب میں مصنف کی تصویر کے علاوہ تیرہ رنگین تصاویر ہیں جو بہترین مصوّروں کے بہترین کارناموں میں سے منتخب ہیں۔ کتابت اور طباعت میں بہت کم کتابیں "طلسمِ زندگی" کے معیار کو پہنچتی ہیں۔

یہ کتاب اس حسنِ اہتمام سے شائع کر کے بلاشبہ میاں بشیر احمد صاحب نے اردو کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے "طلسمِ زندگی" ہر صاحبِ ذوق کے کتب خانے کی زینت بننے کے قابل ہے۔ اقتباس

قیمت فی نسخہ مجلد پانچ روپے (صہ/)

کتاب منگوانے کا پتہ:-

سید عبد اللطیف۔ دفتر رسالہ۔ ہمایوں۔ لاہور

جہاںؔ نما

عصمت پاشا اور ترکی سیاسیات

مدرسۂ قانون کے گریجوایٹ طلبہ کے سامنے غازی عصمت پاشا وزیراعظم ترکی نے حال ہی میں اپنا سالانہ ایڈریس پڑھا جسے ترکی میں عالمگیر مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ نوجوان گریجوایٹوں کے ساتھ ایک بے تکلفانہ گفتگو بھی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ قانون کے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر بھی تھی۔ تقریر کے پہلے حصہ میں عصمت پاشا نے وہ فرق بیان کیا جو گزشتہ زمانے میں اور جمہوریت کے موجودہ دور میں ہے۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ میدانِ جنگ معاہداتِ صلح اور خدماتِ ملک میں گزار کر اب وہ اُن نوجوانوں کو کامیابی کا راز بتا رہے ہیں جن کی زندگیوں کی ابھی ابتدا ہوئی ہے ۔

اگرچہ اس تقریر میں انہوں نے طلبہ کو مخاطب کیا ہے لیکن درحقیقت اُن کی مخاطب ساری ترکی قوم ہے۔ یہ تقریر جہاں سیاسیات، فرائضِ شہریت تعلیم اور عدل پر ایک خطبہ ہے، وہیں ملک کی بیرونی اور اندرونی حالت اور اقتصادی حکمتِ عملی کا خاکا بھی ہے۔ یہ الفاظ کہ "ایک ہزار نیم انسان" مل کر ایک کامل انسان کا دماغ پیدا نہیں کر سکتے"۔ اور "جس کمی کا ہم شکار ہو رہے ہیں وہ روپے کی کمی نہیں۔ بلکہ علم کی کمی ہے"۔ ترکی قوم کے لئے بڑے غور و فکر کے مستحق ہیں ۔

عصمت پاشا نے کہا کہ جمہوریۂ ترکیہ کے عہد اور گزشتہ تمام زمانوں کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اب ترک ایک ملک اور ایک مملکت کے مالک ہیں۔ یہ ملک ترکی ہے۔ جو لوگ اس ملک میں رہتے ہیں وہ ترک ہیں، اور ترکی وطنیت اور قومیت اس ملک کی آئندہ قسمت کی تشکیل کرے گی۔ مکر و فریب کی روش اختیار کرنا اس دور میں نہ خارجی معاملات میں ممکن ہے۔ نہ داخلی معاملات میں ہمارے خارجی معاملات تسلی بخش ہیں۔ ہماری تمام ہمسایہ حکومتوں کو ہم پر اعتبار ہے۔ کیونکہ ہماری روش میں بے ریائی اور راست بازی ہے۔ ہماری قومی زندگی میں بھی یہی چیز داخل ہے۔ اپنے گھر کے اندر کوئی قوم بھی مشکلات سے آزاد نہیں۔ تاہم دوسروں کے مقابلے میں ہماری حالت بدرجہا بہتر ہے۔ ایک بات ہر اس شخص کو یاد رکھنی چاہیئے۔ جو ترکی کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ کہ اس کو ملک کی بہتری کا بھی اتنا ہی خیال ہو جتنا اسے اپنی بہتری کا خیال ہے۔ ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ملک کی ترقی کا ذمہ وار ہے۔

ترکی شہری کون ہے ؟ کسی شخص سے بھی جو ترک یا ترکی شہری بن کر اس ملک میں رہنا چاہے ہم کوئی غیر معمولی توقع

نہیں رکھتے۔ جو لوگ ترکی حقوق سے متمتع ہونا چاہیں اُن سے ہم فقط اتنا چاہتے ہیں کہ اُن کے دل میں ترکی قوم کی محبت ہو اور ایک سچا شہری بننے کی خواہش +

یہ ہے قانونی صورت، اور ہماری اندرونی اور قلبی کیفیت بھی یہی ہے +

عہدِ گزشتہ میں یہاں کے رہنے والے ذمہ دار اور غیر ذمہ دار سبھی اس ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اغیار کا فرض ہے کہ وہ اس ملک کی تعمیر کے لئے باہر سے روپیہ لائیں۔ اور اہل ملک صرف بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے جائیں +

ملک کے تمام دوسرے معاملات کی طرح اقتصادی معاملات بھی ہمیں سے متعلق ہونے چاہئیں۔ ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے سامنے دوسرے لوگ ہمارے کاروبار پر قبضہ کرنے کا خیال دل میں لائیں۔ یہ ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی

دوستو! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہم نے اس ملک کی فلاح وبہبود کے لئے سالہا سال محنت کی ہے۔ موجودہ نسل اور آئندہ نسلیں ابھی سالہا سال اور محنت کریں گی +

جس کمی کا ہم شکار ہو رہے ہیں۔ وہ روپے کی کمی نہیں، وہ علم کی کمی ہے۔ جو لوگ اپنے علم اور دانش کو استعمال کر سکتے ہیں، روپیہ اُن کے ہاتھوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہماری قومی زندگی کے نشوو ارتقا میں یہ حقیقت نہایت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ جتنا زیادہ ہم اپنے اہم اقتصادی اور مالی معاملات کو سمجھتے جاتے ہیں اسی قدر ہماری آمد کے ذرائع بڑھتے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمیں اپنی قومی زندگی میں سب سے بڑھ کر علم کی ضرورت ہے +

ناقص آدمیوں کے بڑے سے بڑے انبوہ سے ایک کامل انسان نہیں بن سکتا۔ ہزاروں لاعقل اور جاہل انسان بھی ایک "نیم انسان" سے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس وہ زیادہ مضر ہوں گے۔ ہزاروں نیم انسان بھی ایک کامل انسان پیدا نہیں کر سکتے +

انگریزی اور ہندوستانی فلم

برطانی فلم سازی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی متکلم تصویر لندن میں تیار ہوئی ہے جس کا مکالمہ انگریزی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں ہے +

اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ ہندوستانی فلم بیس کروڑ ہندوستانی ناظرین تک پہنچے گی، اور انگریزی فلم باقی انگریزی بولنے والے ممالک میں دکھائی جائے گی +

اردو فلم کا نام "ناگن کی راگنی" رکھا گیا ہے اور انگریزی فلم کا نام "کرما"۔

یہ موجودہ عہد کے ہندوستان کا ایک ڈراما ہے اور اُس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، جسے ایک نئی برطانوی کمپنی "انڈین اینڈ برٹش پروڈکشن لمیٹڈ لنڈن اور ہمنسراے انڈو انٹرنیشنل ٹاکیز لمیٹڈ بمبئی نے مل کر شروع کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ دونوں کمپنیوں نے نوسال تک مل کر کام کرنے کا عہد کیا ہے +

ہندوستان کے اخبارات و رسائل

۱۹۳۲ء کی سٹیٹسٹیکل ایر بک کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۲۹-۳۰ء کے دوران میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے حسب ذیل تعداد میں اخبارات اور رسائل شائع ہوئے :۔

مدراس	۳۰۹	بمبئی	۳۱۴
بنگال	۶۶۳	صوبجات متحدہ	۶۲۶
پنجاب	۴۲۵	برما	۱۹۱
بہار و اڑیسہ	۱۳۶	صوبجات متوسط و برار	۵۵
آسام	۴۳	دہلی	۸۸

شمال مغربی سرحدی صوبہ ۱۳

بکری کا دودھ

برطانیہ میں آج کل بکری کا دودھ کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے اس کے اٹھاؤ کی مقدار دو کروڑ گیلن تک پہنچ گئی ہے +

بکری کا دودھ گائے کے دودھ سے جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ مکھن اور بالائی اس میں زیادہ ہوتی ہے سل کے جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔ عورتوں نے اسے جلد کو خوبصورت بنانے میں نہایت مفید پایا ہے۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ اس کے ساتھ چہرے گردن اور بازوؤں کو دن میں دو تین دفعہ صرف دھو دینے سے رنگ سُرخ سیب کی طرح نکھر جاتا ہے +

آیور دیدک میں بکری کا دودھ سل کو روکنے اور دور کرنے کے لئے بہترین چیز سمجھا گیا ہے۔ اس خیال کو آج کل کی اس نئی تحقیقات سے تقویت پہنچتی ہے کہ بکری کے دودھ میں دُہنیت حیاتین اور کیلسیم سالٹس کثرت سے ہوتے ہیں اور یہ سل کے جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔ آج کل جب کہ سل کی وبا سارے ہندوستان میں پھیل رہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں ایک دو بکریاں رکھی جائیں تاکہ لوگوں کو ایک اعلیٰ درجے کی غذا میسر آئے۔ بکری کے دودھ کی بو اس طرح دور کی جا سکتی ہے کہ جانوروں کو نہلا دھلا کر صاف رکھا جائے +

چند دن جنوبی ہند میں

یہ خیال مدتوں سے یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا کہ لندن کی سیر آسان ہے لیکن مدراس پہنچنا مشکل ہے نہیں معلوم مدراس کے لفظ میں کیا بات ہے کہ شمالی ہند کا باشندہ اس کا نام سنتے ہی کالا پانی نہ سہی کسی کالی سی سرزمین کا خیال کرنے لگتا ہے حالانکہ ہم سب سکولوں میں پڑھتے سنتے آئے ہیں کہ مدراس ہندوستان جنت نشان ہی کا ایک حصہ اور ایک شہر ہے بمبئی کلکتہ کا ذکر سن کر عموماً دل میں امنگ پیدا ہوئی لیکن مدراس کا نام آتے ہی طبیعت پر گویا افسردگی سی چھاگئی نہیں معلوم کیوں؟

اور اس دفعہ قسمت ہی مجھے اور میری رفیق زندگی کو اُدھر لے گئی ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم وہاں جاتے اور پہنچ جاتے اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو شہروں کو اور نظاروں کو دیکھنے لگ جاتے۔

لیکن ہم خوش ہیں کہ ہم آئے (یہ سطریں **اوٹی** میں بیٹھا لکھ رہا ہوں) اور ہم نے اسی اپنے ملک ہندوستان میں گویا ایک اور دُنیا کا نظارہ کر لیا!

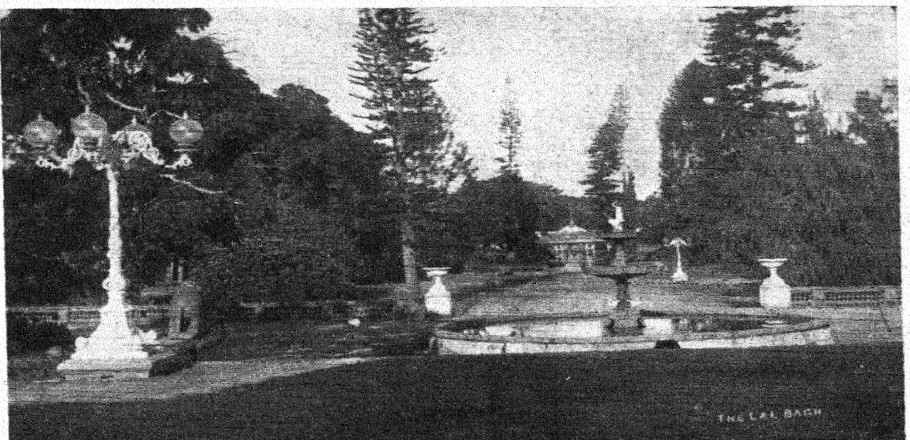
لاہور سے نئی دہلی، وہاں آدھ گھنٹہ ٹھہر کر سیدھے بمبئی، وہاں چار روز قیام کر کے مدراس، وہاں تین روز ٹھہر کر بنگلور، وہاں دو ہفتے رہ کر میسور، وہاں ڈھائی دن بسر کر کے اوٹی، وہاں دس روز لطف اٹھا کر پھر بنگلور ہوتے ہوئے حیدرآباد، اور وہاں تین روز سیر و سیاحت کر کے نئی دہلی اور وہاں چار روز گزار کر پھر لاہور ——— یعنی ۳ فروری کی شام کو گھر سے چلے اور ۲۶ مارچ کی صبح کو پھر لاہور پہنچ گئے۔ نقشہ اس کا یوں ہے ادھر سے لدبم بما اور ادھر سے اب حدل۔ یوں ہم دونوں گئے یوں ہم دونوں گھومے یوں ہم دونوں لوٹے یوں ہم دونوں بخیر و خوبی واپس آپہنچے۔

ل د ب ح م ب م ا

یہاں مفصل پرائیویٹ سفرنامہ لکھنا مقصود نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ یہ ایک سفرنامہ رہے "میاں بیوی نامہ" نہ بن جائے۔ یہ کافی ہے کہ بجز ایک فقرے کے اسے ایک مشترک سفرنامہ سمجھ لیا جائے۔

دہلی کے نصف گھنٹہ قیام میں ہمارا کارنامہ یہی تھا کہ ہم اپنے تین عزیزوں بہن/بھابی بہنوئی/بھائی بھتیجی/بھانجی سے جلد جلد ملے کہ باتیں بہت تھیں اور وقت کم

HUMAYUN LAHORE



لال باغ بنگلور

HUMAYUN LAHORE



اڑی کے نشیب و فراز

بمبئی میں ہم اس لئے ٹھہرے تھے کہ وہاں نواب کھمبایت کے ساتھ مل کر بیگم شاہ نواز صاحبہ کا استقبال کریں جس روز صبح کو ہم وکٹوریا جہاز پر گئے ہمارے آگے آگے معزول شاہ ہسپانیہ کا خیر مقدم کرنے کو بہت سے رومن کیتھلک پادری بھی سفید جتے پہنے بہشت کی چابیاں پہلو سے لٹکائے جہاز پر جا دھمکے۔ تاج محل ہوٹل میں پہنچ کر ہز ایکسیلینسی شاہ ولی خاں فاتح کابل سے طویل ملاقات اور سیاسی و معاشری معاملات کے متعلق مفصل گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا اور اُس نئی ترقی کی مستقل رو کا دل خوش کن اندازہ ہوا جو آج کل اسلامی ممالک میں دوڑ رہی ہے۔ بمبئی سے ہم سیدھے مدراس گئے +

سچ یہ ہے کہ **مدراس** کو دیکھ کر شروع شروع میں میں بہت مایوس ہوا۔ نہ یہاں کلکتے سی عالیشان عمارات نہ بمبئی کی سی گہما گہمی نہ دہلی کے سے اردو محاورے نہ لاہور کی سی پنجابی بے تکلفی۔ پھر سوچا کہ اتنا روپیہ صرف کر کے یہاں آئے ہیں یہاں کی خوبیوں کو غور سے ڈھونڈنا اور دیکھنا چاہیئے۔ سوچا کہ مدراس کا دال بھات مشہور ہے مدراس کی آیائیں مشہور ہیں۔ مدراس پر ایمڈن نے گولہ باری کی تھی۔ مدراس ہمارے ہی ملک کا ایک نہایت مشہور شہر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مابدولت اب خود مدراس آئے ہیں، غرض مدراس کوئی بُری جگہ نہیں بلکہ ایک خاصا مشہور و معروف مقام ہے۔

رونق اور شان و شوکت کے لحاظ سے بلاشبہ مدراس کلکتہ اور بمبئی کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ اگر اس کے سمندر کو نکال دیا جائے تو یہ لاہور سے بھی کمتر ہے اور پھر ایک شمالی آدمی کے لئے اس کے باشندے ان کی طرزِ بود و باش اُن کی وضع قطع ان کی بول چال سب اجنبی اور نادل خوش کن ہیں طبیعت گھبراتی ہے کہ ہم کہاں تھے اور کہاں آ گئے لیکن جب وہ ذرا صبر و تحمل سے کام لیتا ہے تو اسے معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہاں بھی کچھ جاننے کے قابل آدمی اور کچھ دیکھنے کے لائق چیزیں ہیں۔ مدراس بہت پھیلا ہوا شہر ہے۔ بمبئی کے مقابلے میں یہاں بہت کم سہ منزلہ و چہار منزلہ عمارات ہیں بلکہ "کالے شہر" میں تو دو منزلہ عمارات بھی بہت زیادہ نظر نہیں آتیں۔ پر رونق بازاروں میں بھی جا بجا چھوٹی چھوٹی نیچی سی دوکانیں ہیں جیسے کسی دس بیس ہزار کی آبادی والے بڑے قصبے یا چھوٹے شہر کی حالت ہو۔ اس سے دیکھنے والے پر رعب تو نہیں پڑتا لیکن شاید اس سے شہر کی آب و ہوا اچھی رہتی ہے اور ایک بھلے مانس خاموش طبع آدمی کا دم نہیں گھٹتا مارکیٹ ہسپتال، عجائب خانہ۔ لائبریری، ماؤنٹ روڈ، جزیرہ، "قلعہ یہ دیکھ کر سامنے سمندر کی طرف آؤ" مصنوعی بندرگاہ پر ایک نظر ڈالو اور "مچھلی خانے" سے ہو کر "میرینہ" یعنی "بحریہ" سڑک پر ٹہلتے ہوئے بحرِ ناپیدا کنار کا نظارہ کرو تو دہلی لاہور کانپور سب بھول جاتے ہیں۔ سمندر نے مدراس کو ایک پر عظمت دنیا سے جا ملایا ہے اگرچہ یہی سمندر ہے جس نے اسے جنگِ عالمگیر کے آغاز میں ایمڈن کی گولہ باری کا مزا چکھایا تھا چنانچہ سامنے کی سڑک پر ہائیکورٹ کی خوشنما عمارت کے احاطے کی دیوار پر ایک کتبہ نصب کیا گیا ہے جہاں ایک جرمن گولہ پڑا تھا۔ ہمارے دورانِ قیام میں بندرگاہ میں ایک جرمن کروزر "کیلن" اپنے بحری دورے پر آیا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جوق در جوق اسے ہر روز دیکھنے کو جاتے تھے کہ چلو اپنے پرانے دوست ایمڈن کا بھائی

دیکھیں۔ مدراسیوں کی شکلیں اور لباس عموماً سادہ ہوتے ہیں بمبئی سے آتے ہوئے رستے میں ایک سٹیشن پر جو سٹیشن ماسٹر کو دیکھا تو کسی کا "سو دیشی ریل" والا مضمون معاً یاد آ گیا۔ ایک کرتہ ایک تہ بند اور لباس ختم۔ سر پر سامنے کے بال سکھے کی نذر، پیچھے چوٹی جیسے کوئی نسوانی ہستی محو ناز ہو۔ نیچے پاؤں ننگے اور ہاتھ میں ایک جھنڈی سبحان اللہ۔ لیکن مدراسیوں کی عقل یقیناً اُن کی شکل سے اور اُن کے اطوار بھی شاید ان کے لباس سے زیادہ مرغوب ہوتے ہیں جس سے خیال کیا جاتا ہے کہ آخر ہم بانکے لوگ شکل کو لباس کو ایک فضول اور بے معنی اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ بھی تو آخر صدیوں سے انگریزوں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ البتہ ان کے اور یہاں کے مقامات کے نام ضرور قابل اعتراض اور قطعاً ناقابل برداشت ہوتے ہیں مثلاً جیا لکشمانی، کرشنا ولاس لنگا جمانی۔ آکسفورڈ میں میرے ایک جنوبی ہند کے رہنے والے دوست کا نام تھا

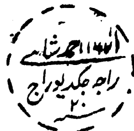
"سرل کرسٹوفر آریا نایاگم برلوٹستو نا یا گم"

اور پھر ان لوگوں کو عادت ہے کہ جرمنوں کی طرح کم از کم انگریزی حروف میں ایک مرکب نام کو اکٹھا کر کے لکھ دیتے ہیں مثلاً کرشنا مورتی پورم کو لکھیں گے (Krishnamurthy-puram)۔ ایک اور بات سے مدراس میں بلکہ تمام جنوبی ہند میں ہم بہت متاثر ہوئے۔ یہ کالے کلوٹے ٹھگنے ننگے سر ننگے پیر والے بھلے مانس لوگ شمال کے بھاری بھر کم سجیلے آدمیوں کے مقابل میں زیادہ صاف رہتے ہیں شاید اس لئے کہ ان کی ضروریات زندگی کم ہیں اور یہ زیادہ سادہ مزاج ہیں، کچھ بھی ہو ہم کوئی وائسرائے وائسرانی نہ تھے کہ ہمارے آنے پر خاص اہتمام کیا جاتا سو تعجب ہو کہ جہاں بھی ہم گئے جس بازار جس گلی سے بھی ہم گزرے ہم نے کہیں بھی ایسی غلاظت ملاحظہ نہ کی جو ماشا اللہ دہلی اور لاہور میں جابجا رونق افزائے شہر ہے اور لاہور سی بیکو نے "آفریں" سڑکیں تو جنوب بھر میں کہیں نہ دیکھیں نہ محسوس کیں۔ مدراس سے تین چار میل پر ایک چھوٹی سی ندی کے دہانے پر سمندر کے عین قریب آدیار کی بستی ہے اور وہاں ایک خوشنما روح پرور جگہ پر جہاں یہ ندی سمندر میں گرنے سے پہلے ننھے ننھے جزیرے بناتی ہوئی چلی جاتی ہے تھیاسفی سوسائٹی کا مقام ہے۔ ایک دو منزلہ عمارت ہے آگے ندی اور سمندر ہے اور پیچھے ایک باغ، ہم ہال میں داخل ہوئے تو ہمارے ارد گرد مختلف مذاہب کے مظاہر پیش نظر تھے، کرشن بدھ مسیح کی تصویریں تھیں پیغمبر اسلام کی جگہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ اور لایمسہ الا المطہرون کا خوبصورت طغرا تھا۔ یعنی یہ سب صداقت کے رستے ہیں حقیقت کی طرف جاتے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ اوپر کی منزل میں مسز اینی بسنٹ خاموشی سے اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی ہیں اور اب کسی سے ملتیں نہیں۔

مدراس سے ہم بنگلور پہنچے کہ یہی ہماری منزل مقصود تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ کراچی کی آب و ہوا سے فائدہ اٹھائیں پھر کسی نے کہا کہ کراچی تو گویا پاس ہی ہے جب جی میں آیا ہوا بندر جا پہنچے لیکن ایسی جگہ کیوں نہ جاؤ جس کی ہوا بھی صحت افزا ہو اور جو نئی بھی ہو۔ اس طرح لاہور سے بمبئی اور مدراس ہوتے ہوئے بنگلور پہنچے۔ لاہور اور بنگلور اسوائے ہم قافیہ ہموزن ہونے کے ان دو مقامات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ درجۂ حرارت کم از کم ۸ سے زیادہ سے زیادہ ۸۰ ہوتا ہے اور یہاں

میسور کا اوسط ۶۸ سے ۸۵ درجہ تک ہے) لاہور کی طرح ۷ اسے شروع ہو کر ۱۱۷ پر ختم نہیں ہوتا۔ یہاں وہ پنجاب کی سی افراط تفریط نہیں نہ آب و ہوا میں نہ معاشرت میں نہ سیاست میں۔

فی الحقیقت ریاست میسور بہت سی حیثیتوں سے ایک قابل رشک خطۂ ملک ہے۔ سطح کی بلندی دو سے تین ہزار فیٹ تک ہے اور اس لئے یہاں کی آب و ہوا معتدل اور بالخصوص کمزوروں کے لئے صحت افزا ہے۔ یہ ایک کوہستانی سا علاقہ ہے جس میں بہت اونچ نیچ ہے ذرا سی اونچائی پھر ذرا سی ڈھلان دائیں طرف ایک ٹیلا بائیں طرف ایک تالاب یا جھیل اور دور کہیں ایک پتھریلی کہیں سرسبز پہاڑی، یہاں کھلا میدان وہاں گھنا جنگل اور یوں یہ علاقہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ خیال نہ ہو سکتا تھا کہ لاہور سے جنوب کی طرف تقریباً دو ہزار میل کے فاصلے پر آب و ہوا اتنی جانفزا اور میدان ایسے شاداب ہوں گے۔ رفیق حیات کے علاوہ ایک اور رفیق اس تمام سفر میں میری شریک سفر بلکہ رہنما تھی اور ہر شہر میں وہ ایک نیا چولا بدلتی تھی اور مجھے اور میرے ذریعے ہم دونوں کو اپنے ساتھ نت نئے نظارے دکھاتی تھی۔ یہ میری گائڈ بک (رہنما کتاب) تھی۔ بمبئی میں بمبئی کی مدراس میں مدراس کی بنگلور میں بنگلور کی "رہنما" اپنے اپنے نقوش کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتی تھی۔ اسی سے میسور کے تاریخ و جغرافیہ کا پتا ملا۔ ہزاروں سال ہوئے رام اپنے بن باس میں ان میدانوں اور پہاڑوں میں گھومے۔ اشوک کی سلطنت یہاں تک پھیلی ہوئی تھی چنانچہ میسور کے شمال مشرق میں اشوک کا ایک ستون پایا گیا ہے۔ پھر گنگائی وغیرہ خاندانوں کے عہد حکومت کے بعد چولہ خاندان کے حکمران راجہ راجہ نے ۱۰۰۴ء میں یہاں اپنا سکہ جمایا۔ پھر گیارھویں سے چودھویں صدی کے شروع تک میسور ہوسالہ خاندان کے زیر نگیں رہا۔ ہوسالہ طرز کے نقش و نگار سے موجودہ مہاراجہ کا عالیشان محل آراستہ ہے۔ ۱۳۰۶ء میں جو سارے جنوبی ہند پر ملک کافور کی برہنہ شمشیر بجلی کی طرح چمکی تھی میسور نے بھی اس کی ایک جھلک دیکھی۔ اس کے بعد وجیا نگر یعنی بیجا پور کے راجاؤں نے یہاں اپنا تسلط بٹھایا یہاں تک کہ ۱۵۶۵ء میں تلی کوٹ کے میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں اس جنوبی ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سے قبل ۱۳۹۹ء میں دو بھائی جن میں سے ایک کا نام یادو رایا تھا کاٹھیاوار سے اپنی جوانی کے جوش و قوت کے نشے میں سرشار جنوب کی طرف نام و نمود کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے یادو رایا جب میسور میں پہنچا تو اس نے سنا کہ ایک شخص مارا ناٹک نامی یہاں کی ایک شہزادی کو بزور اپنے عقد میں لانا چاہتا ہے۔ یادو رایا نے مارا ناٹک کو موت کے گھاٹ اتارا اور شہزادی سے شادی کر کے میسور کے موجودہ و پار خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں مغلئی قوت کا اثر یہاں بھی محسوس ہوا۔ چنانچہ راجۂ وقت نے مغل اعظم سے اپنے لئے ایک مہر حاصل کی یہ مہر کسی طرح گم ہو گئی اس لئے احمد شاہ کے عہد میں دوبارہ اعطائے مہر کی درخواست کی گئی۔ یہی مہر آج تک ریاست میسور کی مہر بنی ہوئی ہے اس کی صورت یوں ہے:-



یعنی انگریزوں نے حیدر علی سے شکست کھا کر ٹیپو کو شکست دے کر اصلی ہندو راجہ کو تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ ہندو راجہ اب بھی مغلوں کی عطا کردہ سند کو اپنا طغرائے امتیاز بنائے ہوئے ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ میسور میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات پسندیدہ ہیں اور یہ ریاست اس فضا میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اٹھارھویں صدی میں جنوبی ہند میں لڑائی کا بازار گرم رہا۔ مرہٹے نظام انگریز فرانسیسی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس جنگ و جدال میں بیچارے میسور کی کیا حقیقت تھی۔ راجہ یہاں کا کمزور تھا اور عجب نہ تھا کہ اس خاندان کا نام و نشان تک مٹ جاتا کہ ایک منچلا نائک حیدر علی حاکمِ وقت کا بازو بن گیا اور بڑھتے بڑھتے ۱۷۶۱ء میں خود میسور کا حکمران ہو گیا۔ نظام مرہٹے انگریز وہ سب کے ساتھ پورا اترا۔ قلعۂ مدراس کو وہ دن یاد ہوں گے جب سلطان حیدر علی دور سے یلغار کرتا ہوا اس کے دروازوں پر آ دھمکا اور اس سے صلح کرتے بنی۔ سلطان حیدر علی کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو سلطان بنا۔ ٹیپو نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کی تباہی کے دن آ چکے تھے نپولین کو بھی چٹھیاں لکھیں کہ آؤ اور ان دشمنانِ نوعِ انسان کے خلاف میری مدد کرو۔ اس نے جھوٹا سچا وعدہ بھی کیا مگر ادھر ولزلی اور ویلنگٹن سے زمانہ شناس اور زبردست غنیم انگریزی سلطنت کو مستحکم کرنے پر تلے بیٹھے تھے ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹم پر حملہ کیا، ٹیپو لڑتے لڑتے مارا گیا۔ انگریزوں نے پرانے ہندو خاندان کے ایک رکن کو تخت پر لا بٹھایا۔ ۱۸۶۵ء میں راجۂ وقت نے موجودہ راجہ کے باپ چامر جندرا کو اپنا متبنیٰ بنایا جس نے ۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۴ء تک بڑی خوبی سے حکومت کی۔ موجودہ راجہ کرشنا رجندرا نے ۱۹۰۲ء میں عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد اکتیس برس میں میسور کو ایک قابلِ رشک ریاست بنا دیا ہے۔

میسور ہندوستان میں سب سے پہلی حکومت تھی جس نے لوگوں کو خود اختیاری حکومت کا اولین سبق سکھایا۔ میسور میں مجلسِ عاملہ کے علاوہ نیابتی مجالس اسمبلی اور کونسل ہیں۔ اسمبلی کی بنا ۱۸۸۱ء میں پڑی۔ اسی طرح بعض اور باتوں میں بھی میسور نے پہل کی۔ ریاستوں میں سب سے پہلے میسور نے ۱۹۱۶ء میں اپنی یونیورسٹی قائم کی۔ بنگلور ہندوستان کا سب سے پہلا شہر تھا جہاں ۱۹۰۵ء میں بجلی کی روشنی کی گئی۔ آج یہ حالت ہے کہ ۸ روپے ماہوار میں میسور کا ایک دیہاتی ہر رات اپنی جھونپڑی میں بجلی کے لیمپ کی روشنی استعمال کر سکتا ہے۔ ایک اکیلے میسور کے شہر میں ...۸۰ لوگوں کے لئے ۱۶ حفظانِ صحت کے مرکز ہیں میسور اور بنگلور میں ایک ایک لیڈیز کلب ہے۔ یہاں کی عورتیں بہت تعلیم و ترقی یافتہ ہیں اور معاشری کاموں میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ ریاست بھر میں تعلیم مفت اور جبری طور پر دی جاتی ہے۔ ریاست تعلیم پر اپنی تمام آمدنی کا بیس فیصدی حصہ صرف کر دیتی ہے۔ ملک کے ایک مشہور مخیر نصروان جی ٹاٹا نے جب ۱۸۹۶ء میں ملکی ترقی کے لئے ایک ادارۂ طبیعیات (Institute of Science) قائم کرنے کی ٹھانی اور اس مقصد کے لئے تیس لاکھ کی گرانقدر رقم وقف کر دی تو بنگلور کو یہ شرف حاصل ہوا کہ یہ ادارہ وہاں قائم کیا گیا اور اس کی ایک شاندار عمارت تیار کی گئی۔ حال ہی ماہ مارچ ۱۹۳۳ء میں مہاراجہ نے اسی شہر میں ایک عظیم الشان صنعتی ادارے کی بنا رکھتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کو ادب و فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کے اداروں کی سخت ضرورت ہے بلکہ

یہی وہ تعلیم گاہیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم موجودہ تمدن کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہوں گے اور زندگی و تمدن کا صحیح مفہوم سمجھیں گے۔ ایسی بڑی بڑی چیزوں کے ساتھ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اس ریاست نے حیرت انگیز ترقی کی ہے بنگلور سے جب ہم موٹر میں سونے کی کانیں اور پھر کاویری کے آبشار دیکھنے گئے تو ہم یہ دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئے کہ سڑک کے پاس جہاں جہاں کوئی پانچ چھ جھونپڑیوں کا گاؤں بھی تھا وہاں پتھر کے ایک بورڈ پر اس گاؤں کا نام انگریزی اور کناری زبان میں کندہ تھا۔ میں نے کبھی یورپ میں بھی یہ جدت نہیں دیکھی۔ میسور میں زیادہ تر کناری یا کناڈا زبان بولی جاتی ہے۔ ریاست کی ۶۵½ لاکھ آبادی میں سے تقریباً ۴۶ لاکھ کناڈا، ۱۰ لاکھ تامل ۳ لاکھ تلیگو اور ۴ لاکھ ہندوستانی اور باقی اور متفرق زبانیں بولتے ہیں (دو تین اردو اخبار نکلتے ہیں جن میں ایک روزانہ اخبار ہے) مذہباً یہاں تقریباً ۶۰ لاکھ ہندو ۴ لاکھ مسلمان ۱۰۰ سکھ ۹۳ یہودی اور باقی عیسائی پارسی وغیرہ آباد ہیں۔ میسور اپنے مندروں کے لئے مشہور ہے۔ سومناتھ پور اور بیلور کے مندر سنا ہے کہ قابل دید ہیں۔ ہم نے اپنے اس سفر میں بمبئی میں "Elephanta" ایلیفنٹا (دنیلہ) کے دلکش جزیرے کی سیر اس لئے کی کہ اس کے شہرۂ آفاق مندر کی مورتوں سے پھر تعارف حاصل کریں۔ یہ مندر ایک کوہستانی غار کے اندر کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ داخل ہوتے ہی سامنے ترمرتی یعنی برہما شو اور وشنو کی مورتیں کھڑی نظر آتی ہیں۔ برہما کی ۹ فٹ اونچی عظیم الشان مورتی پہاڑ کی دیوار پر ابھری ہوئی کھڑی ہے، اس کے دائیں بائیں ہندومت کے دوسرے دو خداؤں شو اور وشنو کے بت ہیں۔ یہ مندر شو کے نام سے منسوب ہے۔ اور اس میں ایک کمرہ لنگم کا عبادت کدہ ہے۔ ان کے علاوہ شو اور پاربتی کی شادی کی مورتیں اور اور بہت سی مورتیں بھی ہیں۔ ہندوؤں میں زیادہ تر اب شو کی پوجا کی جاتی ہے برہما اور وشنو کا نام کم سنا جاتا ہے۔ شہر میسور کا پس منظر ایک خوبصورت پہاڑی چامنڈی ہے اس پر جو چامنڈیشوری مندر ہے وہاں بجائے شو کے وشنو کی عبادت کی جاتی ہے۔ ہم نے رات کے وقت جگمگاتی روشنیوں میں اسے دیکھا اور پہرہ داروں نے ہمیں صرف دور دروازے سے چمکتی دمکتی مورتی کے دیکھنے کی اجازت دی۔ ان کے علاوہ ہم نے دو ایک بیل والے مندر دیکھے۔ ایک عظیم الجثہ بیل بیٹھا ہوتا ہے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ چامنڈی کی پہاڑی پر ایک ۲۵ فٹ لمبا اور ۱۶ فٹ اونچا بیل "باہر کھلی ہوا میں بیٹھا ہوا صدیوں سے نیچے کی وادیوں کا نظارہ کر رہا ہے میسور اور بنگلور کے شہروں میں بعض چھوٹی چھوٹی خوبصورت مسجدیں ہیں اور سڑک کے قریب اکثر چھوٹے دیہاتوں میں ہم نے کہیں کہیں مسجدیں اور اکثر عیدگاہیں دیکھیں مسلمان میسور میں خوش ہیں اور ان میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

بنگلور کے شہر میں میں نے وہاں کی اسلامی کانفرنس کا ایک کارنامہ ایک "موٹر بس" کی صورت میں دیکھا۔ اس پر کانفرنس کا نام لکھا ہے اور کانفرنس کے کارکن دور دراز دیہات میں اس کے ذریعے سے دورہ کرتے اور عوام الناس تک تعلیم و ترقی کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ سکولوں میں مسلمانوں کو اردو پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض انگریزی اور کناڈا زبانوں سے بھی خاص واقفیت حاصل کر کے اب اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں۔

ریاست میسور میں بنگلور مختلف مصروفیتوں کا مرکز ہے۔ اس کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے مختلف قوموں اور مذہبوں

کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ انگریزوں اور اینگلوانڈین لوگوں کی ایک خاص تعداد یہاں آباد ہے بنگلور میں اتنے بنگلے ہیں کہ پہلے پہل میں سمجھا کہ بنگلور کی یہی وجہ تسمیہ ہوگی کہ وہاں بہت سے بنگلے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ "بنگلور" ایک قسم کے اناج کا نام ہے یہ شہر خوبیٔ آب وہوا اور سامانِ آرام و آسائش کی ارزانی کے لحاظ سے ہندوستان کے اکثر شہروں سے بازی لے گیا ہے اور اسی سے ریاست میسور کا نام زبان زدِ خلائق ہو رہا ہے۔ یہاں گھوڑدوڑ پولو تماشے اور مختلف تفریحات کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

بنگلور میں دو نہایت خوبصورت وسیع باغ ہیں۔ بکن پارک اور لال باغ۔ بکن پارک میں سرکاری دفاتر، لائبریری، کلب اور عجائب خانے کو بھی جگہ دی گئی ہے اور لال باغ میں مختلف قسم کے خوبصورت پودوں اور درختوں کی کاشت کی گئی ہے۔ لال باغ سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہدِ حکومت کی یادگار ہے۔

میسور کے باشندے سیدھے سادھے اور کالے کلوٹے سے ہیں لیکن وہ دورِ حاضر کے سب کھلونے سب چرخیاں سیٹیاں استعمال کرتا ہی یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپلٹیاں ریل تار، بجلی ٹیلیفون، ہر کیں تارکول والی، ہسپتال ایکسریز والے، باغوں میں بینڈ، بازاروں میں سینما اس کے علاوہ صنعت و حرفت کے بیسیوں کارخانوں سے حکومت اور رعایا مستفید ہو رہے ہیں صابن چینی کے برتن صندل کی لکڑی ریشم کے کپڑے کی یہاں ساخت ہوتی ہے بنگلور اور میسور کے درمیان **سیواسمدرم** (شوسمدر یعنی شو کا سمندر) کے گاؤں کے پاس دریائے کاویری کے آبشاروں کے قریب میں پانی کو بڑی بلندی سے گراکر اس سے بجلی پیدا کی گئی ہے جو سارے میسور کو برقی قوت سے فیضیاب کرتی ہے اس کی مدد سے کولار کی سونے کی کانیں اپنا سونا اگلتی ہیں بڑے بجلی گھر میں ہمیں بتایا گیا کہ اگر یہاں دس منٹ تک کام بند ہو جائے تو سونے کی کانوں میں ہزاروں مزدوروں کی جان جوکھوں میں پڑ جائے اس لئے انہوں نے مناسب انتظام کر رکھا ہے۔ ہم نے جب ان دو بجلی اور سونے کے کارخانوں کی سیر کی تو منتظموں نے ہمیں اندر جانے سے پہلے بہت سی باتیں سمجھا دیں کیونکہ کارخانے کے اندر کلوں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی دورِ حاضرہ کے شیطانی چرخے انسان کے ذرا ذرا سے اشاروں پر خوب اپنا کام کر رہے تھے اور ہمارے لئے ہزاروں آسائش و آرائش کے سامان پیدا کر رہے تھے **کولار** میں پانچ کانیں ہیں ۱۸۷۳ء میں بنگلور کے ایک انگریز باشندے نے ریاست سے ان زر آمیز زمینوں کا ٹھیکہ لیا۔ دس سال کی محنت اور صرفِ کثیر کے بعد ایک انگریزی کمپنی نے بڑے پیمانے پر زمین کے پیٹ میں سے سونا نکالنا شروع کر دیا اس وقت سے لے کر آج تک انگریزوں نے ایک ارب روپے کی مالیت کا سونا یہاں سے پیدا کیا جس کے عوض میں انہوں نے پانچ کروڑ روپیہ ریاست کو ادا کیا۔ اس زریں سرزمین کے ایک ایک سنگریزے میں سونے کی چمک ہے گو وہ عموماً دکھائی نہیں دیتی یعنی صرف پرکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ فلاں سنگریزہ زر آمیز ہے فلاں بے زر ہاں نیچے کانوں میں کئی جگہ چٹانوں میں سنہری لکیروں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ واقعی سونے کی کان ہے بائیس ہزار آدمی ان کارخانوں اور کانوں میں کام کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کا کام خطرے سے خالی نہیں ہوتا چنانچہ ہمارے وہاں جانے سے چار روز پہلے ہی ایک کان میں پانچ سات کان کن آدمی دب کر پس گئے بعض چٹانیں سات ہزار فیٹ گہری ہیں چٹانوں کو بارود سے اڑایا جاتا ہے اور پھر پتھر اور سنگریزوں کو گاڑیوں میں لاد کر برقی قوت سے اوپر کھینچ لیا جاتا ہے۔ یہ قیمتی پتھر روڑے پھر طرح طرح کے شکنجوں اور چھلنیوں میں سے ہو کر گزرتے ہیں جب کہیں جاکر سونا ہاتھ سے دیتے ہیں پتھروں کے اڑانے اور کاٹنے سے ہزاروں سال کی جمی ہوئی چٹانوں میں جو جنبش پیدا ہوتی ہے وہ لہذا وفات ایک چھوٹے سے زلزلے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے نہ صرف کانوں کے زمین دوز گلی کوچے بلکہ اوپر صنعتی آبادی کے مکان اور

جھونپڑے سر تا پا کانپنے اور جھومنے لگ جاتے ہیں قدرت سے چھیڑ خانی کر کے انسان کو اپنی شوخی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے من چلے لوگ اس اونچائی پر زیادہ چیں بہ جبیں نہیں ہوتے، بزدل آدمی اپنے گھروں میں دبک کے بیٹھ رہتے ہیں اور یہاں تو خیر صرف چند ۱۲ روپیہ لینے والے کالے مزدوروں کی جان کا سوال ہے بعض دفعہ کئی لنگوٹی پوشوں کی جان جاتی ہے تو ایک گون یا ساڑھی پہننے والی کے کانوں کے لئے آویزوں کی ایک جوڑی تیار ہوتی ہے بجلی اور سونے کے ان کارخانوں کے لئے دریائے کاویری کے پانی کی جو مقدار درکار ہے وہ قدرت کی طرف سے مہیا نہیں ہوتی ہمارے شمالی ہمالیائی دریاؤں کی طرح دکن کے دریاؤں میں باقاعدگی اور استقلال کا وصف نہیں وہاں تو ایک دریا دریا ہوتا ہے ہمیشہ دریا دلی دکھاتا ہی رہتا ہے اور بڑی شان و تمکنت سے روز و شب بہتا رہتا ہے لیکن یہ نہیں آسمانی برکات یعنی بارش کے موسم میں تو یہاں کے ندی نالے بھی دریا بن جاتے ہیں بڑے زور و شور سے بلکہ طیش میں آ کر بہتے ہیں لیکن جہاں بارشوں کا سلسلہ تھما جہاں سردیاں آئیں اور پھر گرمیوں کا آغاز ہوا کہ یہ تند مزاج دھیمے پڑتے اور ایسے دھیمے پڑتے کہ صم بکم نہ خود بولتے ہیں نہ کسی کی سنتے ہیں اگر یہیں تو سنیں بالکل ہی نابود ہو جاتے ہیں۔ مدراس کی طرف ریل میں آتے ہوئے دریائے تنگ بھدرا کا خوفناک نام اپنے نقشے پر دیکھا میں سمجھا کوئی سندھ یا پنجاب یا گنگا یا راوی کا بھائی بند ہوگا، ریل اوپر سے گزرے گی تو پانی لہریں لیتا ہوا اوپر کو اچھلے گا اور ہم وقتاً ربنا عذاب الملک کہتے ہوئے سمٹ جائیں گے لیکن یہاں پتا ہی نہ چلا کہ دریا کب آیا اور کب ہم اس کے اوپر سے گزر گئے۔ اسی طرح ہزاروں ”ناپیدا کنار“ دریا اور ندیاں تھیں کہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ زمینیں ہیں کہ دریاؤں ندیوں کے پاٹ ہیں فضول ریل والوں نے پل بنا رکھے ہیں قصہ کوتاہ دکن کے دریا عموماً بے اعتبار ہوتے ہیں کبھی پانی بہت زیادہ کبھی بہت ہی کم یہی حال کاویری کا ہے جو میسور کا دریائے نیل ہے۔ اس کے تلون سے ڈر کر اور اس کا سد باب کرنے کے لئے حکومت میسور نے شہر میسور سے چند میل کے فاصلے پر دریائے کاویری میں ایک زبردست طویل و عریض بند لگا کر اس کا پانی ایک عظیم الشان جھیل کی صورت میں جمع کیا ہے۔ یہ نیل پر اسوان کی جھیل کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ہے۔ یہ بند جس پر موٹر گاڑیاں خوب چلتی ہیں تقریباً سوا سو فیٹ اونچا اور تقریباً پونے دو میل لمبا ہے اس میں جا بجا آہنی دروازے ہیں۔ ہر روز مخصوص اوقات پر چند دروازوں کو کھولا جاتا ہے یعنی دریا کو نیچے بہنے کی اجازت دی جاتی ہے اس بہاؤ اور گراؤ کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ پانی چار روز میں جا کر سیوا سمدرم کے سنگم پر پہنچتا ہے جہاں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے بجلی پیدا کی جاتی ہے بند اور جھیل کا ایک مقصد یہ ہے کہ جن دنوں میں دریا میں پانی کی کمی ہو ان دنوں میں بھی جھیل سے پانی مہیا کیا جا سکے اس کے علاوہ اس دریائی جھیل سے بہت سی نہریں نکالی گئی ہیں جن سے تقریباً تیرہ لاکھ ایکڑ زمین کے سیراب ہونے کا اندازہ ہے۔ بند موجودہ راجہ کے نام پر کرشنا راجہ ساگر بند کہلاتا ہے۔ بند کے جنوب کی طرف موجودہ مسلمان دیوان کے مشورے کے مطابق ایک مغلئی طرز کا تختوں والا باغ بنایا گیا ہے جس میں طرح طرح کے فواروں اور آبشاروں سے پانی کے کھیل تماشوں کا نظارہ پیش نظر ہوتا ہے

بنگلور سے جب ہم اپنے فہیم و با مذاق صادق دوست کے ہاں میسور آئے تو وہاں آ کر ہم نے ان کی موٹر میں اس قابل دید بند کی اور اس کے بعد مشہور تاریخی شہر سرنگاپٹم کی سیر کی۔ سرنگاپٹم میسور سے ۹ میل کے فاصلے پر دریائے کاویری میں ایک جزیرے کی صورت میں واقع ہے یہ میسور کے راجاؤں کا پرانا دارالسلطنت تھا اور پھر سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا پایۂ تخت بنا یہاں بہت سی قابل دید عمارتیں ہیں مثلاً زنداں جہاں انگریز قیدی رکھے جاتے تھے فصیل کا وہ حصہ جہاں سے انگریزی فوج نے قلعے پر حملے کئے ٹیپو کی مسجد دریا دولت باغ اور محل جس کی گلکاریوں اور تصویروں کے رنگوں کی شوخی آج بھی خاص طور پر نمایاں ہے (اس میں ایک بہت بڑی دیواری تصویر ہے جس میں انگریزی قائد کرنل بیلی کو پالکی میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے کہ حیدر علی کے ہاتھوں شکست کھا کر ندامت سے اپنی انگلی کاٹ رہا ہے) پھر ۱۲ فیٹ کی نیچی سی محراب جیسے ایک

فرانسیسی انجنیئر نے ٹیپو کو اپنی تعمیری قابلیت دکھانے کے لئے بنایا تھا۔ اور جس میں یہ خوبی ہے کہ اس کے اوپر جا چڑھو اور زور سے پاؤں دے دے مارو تو وہ خاصی ہلنے لگتی ہے۔ اور "گنبد" یعنے حیدر علی اور ٹیپو کا مزار جہاں وسط میں سلطان حیدر علی کا مزار ہے اور اس کے ایک طرف ٹیپو کا اور دوسری طرف ٹیپو کی والدہ فخر النسا سیدانی بیگم کا۔ اُس زمانے میں جب انگریزوں اور فرانسیسوں کی باہم لڑائیاں ہو رہی تھیں اور نظام اور مرہٹے کبھی آپس میں اور کبھی دوسروں سے برسرپیکار رہتے تھے حیدر علی نے شمشیر ہاتھ میں لیکر ایک خاصی بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اور اُسے اپنے حسن تدبر سے استوار کیا۔ حیدر علی اور ٹیپو کو ظالم کہا گیا ہے لیکن پوچھنا چاہیئے کہ اُس زمانے میں رحمدل کون تھا؟ سیدانی بیگم بڑی فہیم و نکتہ رس خاتون تھی۔ حیدر علی اُس سے ڈرتا تھا اور وہ عموماً اپنے شوہر اور اپنے بیٹے کو سیدھے رستے پر چلنے کی ترغیب دیتی تھی۔ ٹیپو کی بابت جو کچھ مخالفین لکھتے ہیں وہ درست ہو یا غلط لیکن حیدر علی فی الحقیقت ایک نہایت دلیر و حوصلہ مند فاتح اور ایک غایت درجہ دوراندیش و مدبر حکمران تھا۔

جب ہم اس مقبرے کی سیر کو آئے تو دیکھا کہ معزول شاہ ہسپانیہ دروازے سے گذر کر مقبرہ دیکھنے کو جا رہا ہے۔ مرحوم حکمرانوں کے مزار پر ایک معزول حکمران کی موجودگی واقعی عبرت انگیز تھی۔ شاہ الفانسو میسور میں مہاراجہ کے مہمان تھے رات کو جو کھانا للیت محل میں دیا گیا اُس میں ہم بھی مدعو کئے گئے۔ شاہ معزول کی تفریح کے لئے ہندوستانی موسیقی کے نمونے پیش کئے گئے مگر ہندوستانی راگ ہسپانوی مذاق کے مطابق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ خیر اُنھوں نے سُنایا اِنھوں نے سُنا بہت خوب بہت خوب نوش رہیئے! کسی نے ذرا اپنا گلا پھاڑا کسی کے ذرا کان پھٹے مگر خیر ہمارے لئے تفریح کا اچھا خاصا سامان مہیا ہو گیا۔

میسور فی الواقع ایک بے نظیر شہر ہے۔ ہندوستان میں کم شہر ہوں گے جو صفائی اور خوبصورتی اور لطافت کے لحاظ سے اس سے بہتر ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شہر ایک مجوزہ نقشے کے مطابق بنایا گیا ہے۔ سڑکیں عموماً سو فیٹ چوڑی ہیں۔ ہر جگہ صاف سُتھری ہے۔ اور بہت سے مقامات خاص طور پر آراستہ و پیراستہ ہیں۔ چوراسی ہزار کی آبادی کے اس شہر میں عفونت کا نام نہیں۔ اچھوت لوگوں کے محلے کو دیکھ کر ہم ششدر رہ گئے اتنی صفائی اور ترتیب تھی۔ قابل و مدبر مسلمان دیوان سر مرزا اسمٰعیل کے نام پر جو مرزا روڈ بڑے چوک سے ملحق ہے اُسے پیرس کی شانزلیزی سڑک کا ایک چھوٹا نمونہ تصور کرنا چاہیئے۔ اس کے دونوں طرف نشاط باغ ہے۔ سڑک کیا ہے چمن کی ایک سایہ دار خوبصورت روش ہے۔ گھوڑ دوڑ کا میدان دو چھوٹی چھوٹی سی جھیلوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے قریب ہی اُدھر نرسمہ راجہ کی خوبصورت سایہ دار سڑک ہے جو للیت محل کے مرتفع مہمان خانے کی طرف گئی ہے اور دوسری طرف چڑیا خانہ اور مہاراجہ کا وسیع باغ اور خوشنما بیلوں کے پتوں اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ٹھنڈی سڑک ہے۔ آدھ میل کے فاصلے پر مہاراجہ کا عالیشان محل ہے جو اسلامی طرز تعمیر اور ہندی نقاشی کا ایک لازوال نمونہ ہے۔ طاؤسی ایوان۔ درباری ایوان۔ امبا ولاسی ایوان ان کے علاوہ اسلحہ اور تصاویر

اور اور سینکڑوں چیزیں صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ رات کو جب خاص خاص موقعوں پر محل کی بیرونی دیواروں کی پچاس ہزار روشنیاں ایک اشارے پر جگمگ جگمگ کرنے لگتی ہیں تو نزدیک و دور سے ایک بے مثال نظارہ پیش نظر ہوتا ہے۔ حسن اتفاق سے معزول شاہِ ہسپانیہ کی آمد کی وجہ سے ہم نے بھی یہ نظارہ دیکھ لیا۔

کسی ملک یا صوبے یا شہر کی ترقی کا محض ایک شخصیت پر انحصار شاذ و نادر پایا جاتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میسور میں اس کی ایک زندہ مثال موجود ہے۔ موجودہ مہاراجۂ میسور ایک روشن خیال سنجیدہ۔ صوفی مشرب آدمی ہیں۔ قدیم ہندو روایات اور جدید مغربی علوم سے اُن کو بیک وقت رغبت ہے۔ وہ مغربی موسیقی میں دسترس رکھتے ہیں اور مشرقی موسیقی میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ سنا گیا ہے کہ وہ اکثر گھنٹوں اپنا ساز لیکر تنہا راگ میں محو رہتے ہیں+ اُن کے چہرے میں متانت۔ دانش مندی اور کچھ غمگینی سی ملی جلی نظر آتی ہیں+ غمگینی اگر اُن کی زندگی میں ہے تو اس کا رعایا پر اثر نہیں۔ رعایا محنتی اور خوش حال نظر آتی ہے+ اگر تمام ہندوستانی ریاستوں میں اس طرح کی فضا پیدا ہو جائے تو نہ صرف یہ ہو کہ وہاں ہندو مسلم مناقشات کا سدِّباب ہو جائے بلکہ ریاستیں برطانوی ہند کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونے کا کام دینے لگیں۔

میسور اور اُس کی ہمسایہ پہاڑی کو چھوڑ کر ہم موٹر میں سوار ہوئے۔ مشہور کوہستانی مقام اُوٹاکمنڈ کی طرف چل دیئے یہاں ہم سوائے ہوٹل میں اُترے۔ مارچ کا شروع تھا اور بہت کم سیّاح ہوٹل میں فروکش تھے۔ لیکن ہم یہاں آرام کرنے کو آئے تھے اور یہاں کی خاموش فضا سے ہر طرح لطف اندوز ہونے کے تمنائی تھے۔ مگر ہمارے لئے جلد ملاقات و تفریح کا سامان مہیّا ہو گیا۔ ہم ہوٹل میں کل پانچ آدمی تھے۔ اُن میں سے ایک انگریز اور اس کی میم سے جو گذشتہ پندرہ سال سے نیویارک میں کاروبار کرتے ہیں ملاقات ہوئی۔ اُن کے سیاسی خیالات و حالات بہت وسیع اور حریّت آمیز تھے۔ میاں بیوی دونوں مسز اینی بسنٹ کے ہندی تھیاسفی عقیدے کے پیرو تھے۔ نری عیسائیت کے معتقد نہ تھے۔ دورانِ گفتگو میں اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ امریکہ میں خانگی ملازمین تین تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ لیتے ہیں۔ اُنہوں نے خود ایک میاں بیوی کو چھ سو روپے ماہوار پر گھر کے کام کاج کے لئے ملازم رکھا اور اِن کے رہنے کو اپنے گھر ہی میں ایک سونے کا، ایک کھانے کا اور ایک گول کمرہ اور غسل خانہ دیا۔ ملازم میاں بیوی کی اپنی موٹر تھی اور وہ آقا میاں بیوی کی موٹر سے زیادہ نئی اور نفیس تھی۔ ایک دفعہ آقا میاں بیوی کی موٹر بگڑ گئی تو اُنہوں نے ملازم میاں بیوی کی موٹر عاریتہً سواری کے لئے مانگی جب وہ اس پر سوار ہو کر اپنے دوستوں سے ملنے گئے تو اُنہوں نے اُنہیں نئی موٹر خریدنے پر مبارکباد دی+ یہ واقعہ بیان کر کے میم موصوفہ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ امریکہ میں ملازمین کو ملازم (Servant) نہیں کہا جاتا۔ بلکہ (Helper) مددگار ـــ المدد! اِسی دنیا میں آدمی آدمی میں کتنا فرق ہے! خیالات و حالات نے مختلف معاشری طبقات میں کیا کیا تبدیلیاں کر دی ہیں! دیکھیے ہمارے ملک کے غریبوں فقیروں کی کب باری آئے؟

ایک دن کھانا کھا کر باہر نکلے تو ایک بھان متی کو دیکھا۔ بولا

Sir, madam, very nice trick

I know six languages:—

One, two, three - un deux trois - ein, zwei, drei, una, dia, tre وغیرہ وغیرہ یک دو سہ۔

اس کا نام حسین تھا۔ وہ پونا کا رہنے والا تھا۔ انگریزی خاصی بولتا تھا اور فرانسیسی میں تو خوب گفتگو کرتا تھا۔ باقی مغربی زبانوں کی بابت میں اندازہ نہ کرسکا+ اس کے پاس فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں کے سرٹیفکیٹ تھے۔ بڈھا تھا لیکن چُست و چالاک اور خوب سمجھدار آدمی تھا۔ کئی "تعلیم یافتہ" لوگوں سے بہتر انسان تھا!

اوٹاکمنڈ کو مختصراً یا شاید ازراہِ محبت اُوٹی کہتے ہیں۔ جیسے کسی معزز خاتون "اصغار اختام" کو اُس کی سہیلیاں بے تکلفی سے "اچھی" کہنے لگیں۔ اور واقعی نیلگری کے خوبصورت پہاڑوں کی یہ ملکہ پیار کرنے ہی کے قابل ہے+ جنوبی دکھن کی مرتفع سطح میں نیلگری کا کوہستانی سلسلہ بلند ہوتا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چوٹیوں پر سینکڑوں میل مربع ایک اور زیادہ مرتفع سطح نمودار ہوگئی ہے۔ زمین کے ایک خوشنما خوبصورت خطے کو گویا کوہستانی پہلوانوں نے اپنے کندھے پر اُٹھا کر بلند کر دیا ہے۔ اُوٹی پہاڑوں میں ایک عجیب پہاڑ ہے۔ جس میں پتھر شاذ و نادر پایا جاتا ہے۔ اُوٹاکمنڈ کے معنی ہیں ایک پتھر کا گاؤں (تامل میں اُتَی = ایک، کل = پتھر، منڈ = گاؤں) پہاڑ کے اوپر میلوں تک نیم ہموار یا نشیبی زمینیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ نشیب و فراز آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ذرا سی چوٹی پھر ذرا سی وادی پھر ایک چوٹی سی پھر ایک وادی سی، پریوں کے کھیلنے کے اونچے نیچے صحن ہیں۔ یہاں وہ ہمالیہ کی سی حیرت انگیز بلندیاں اور سربفلک چوٹیاں نہیں کہ ایک سے ایک سر نکالتی ہوئی آسمان سے باتیں کرتی نظر آئے۔ نہیں یہاں تو پہاڑوں کے اوپر شاداب زمینوں اور سرسبز ٹیلوں کے ذرا ذرا سے نشیب و فراز ہیں۔ خوبصورت دلکش نشیب ٹہلنے چلنے دوڑنے کودنے کے لیئے جی چاہتا ہے کوئی ذرا دھکا دے۔ اور آدمی ایک بچے کی طرح لڑھکتا ہوا وادی کی گود میں جا لیٹے۔ پھر نیچے سے سو دو سو قدم چلے تو ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچے۔ پھر اسی قدر دوسری طرف کی وادی میں نیچے اُتر جائے پھر ساتھ کی پہاڑی پر جا چڑھے اور اس طرح گھنٹوں سرگشت کرتا رہے۔ پہاڑیوں پر عموماً صرف سبزہ ہے۔ ہلکے رنگ کے پھولوں سے رنگا ہوا اور پہاڑیوں کے درمیان میں جو کھوئیں سی ہیں وہاں سُرخ و سبز و زرد پتوں والے چھوٹے چھوٹے درختوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ ہیں۔ عموماً یہ حالت ہے کہ برہنہ سبزہ پوش پہاڑی ہے اور پھر یہ درختوں کے جھنڈ پھر ایک اور پہاڑی ہے اور اسی طرح ایک اور ننھا سا جنگل اور یوں یہ خوشنما سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ کوسوں تک جہاں تک ٹہلتے جاؤ بلکہ جہاں تک اپنی موٹر لے جاؤ یہ پہاڑیاں ہیں اور یہ نشیب۔ یہ سبزہ ہے اور یہ گنگا جمنی درخت+

مدراس اور میسور میں اکثر ہم نے لوگوں کی یہ وضع قطع دیکھی کہ سر کے بال سامنے سے منڈے ہیں اور اوپر او نیچے موجود ہیں۔ شاید ان لوگوں نے یہ بات اُوٹی کے نشیب و فراز میں قدرت کی بازی گاہ سے سیکھی ہے۔ لیکن کہاں انسان کا وہ نیم گنجا پن اور کہاں قدرت کی یہ معصوم برہنگی سبزہ و گل کے شفاف لباس سے مزین!

اُوٹی میں گذشتہ صدی سے انگریزوں نے نئے درختوں اور پھولوں کی وسیع پیمانے پر کاشت کی ہے اور اس پہاڑ کو یقیناً پہلے سے زیادہ سرسبز و خوبصورت بنا دیا ہے۔

یوکلپٹس (Eucalyptus) کے اونچے اونچے درخت کونین (Quinine) کے دورنگے پتوں والے پیڑ چائے اور قہوہ کے گھنے پودے۔ ریشمی بلوط۔ اکیشیا (Acacia) میلوں تک ان پہاڑوں میں پھیلے پڑے ہیں۔ یوکلپٹس کی بُوباس سے جنگل کے جنگل معطر ہو رہے ہیں۔ گلا اور پھیپھڑے اس خوشبو سے خود بخود صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ کئی اور درختوں اور پودوں اور پھولوں کی خوشبوئیں ملی ہوئی ہیں اور دماغ میں گھر کئے جاتی ہیں۔

ہمالیہ کی پود میں اور نیلگری کی پود میں ایک یہ نمایاں فرق ہے کہ چونکہ نیلگری خطِ استوا اور منطقہ حارہ کے زیادہ قریب ہے، اس لئے اُس کے درختوں پتوں میں رنگوں کی زیادہ آمیزش ہے۔ "دورنگی دنیا" کا پُرلطف نظارہ ہم نے یہاں دیکھا۔ سبز پتوں میں سُرخی کی جھلکیاں ہیں۔ کہیں ایک ہی درخت کے بعض پتے سرخ ہیں بعض سبز کہیں سبزی اور سُرخی کی آمیزش سے بیسیوں درمیانی رنگ پیدا ہو گئے ہیں۔ جن میں سورج کی روشنی میں قوسِ قزح کا سا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

اُوٹی کا "سرکاری نباتاتی باغ" (گورنمنٹ بوٹانیکل گارڈنز) دیکھنے کے قابل ہے۔ سرکاری زراعتی کمیشن کی رائے میں یہ ہندوستان کا بہترین باغ ہے۔ اور واقعی سوائے کشمیر کے شالامار اور نشاط باغ کے کسی اور باغ میں فطرت اور انسان نے اپنے تعاون سے حُسن کے ایسے مناظر کم پیدا کئے ہوں گے۔

نیچے بابِ داخلہ سے ہو کر اُوپر کو آؤ تو پہاڑ کی دو گھاٹیوں کے درمیان یہ چمنستان اس طرح جلوہ آرا ہے جیسے کسی ہنڈولے میں کوئی ننھا بچہ پڑا مسکرا رہا ہو۔ قدرتی نشیب و فراز کی وجہ سے یہ باغ خود بخود تختوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ اِدھر اُدھر گلگشت کرتے جاؤ اور اس کے نئے سے نئے نظارے دیکھتے جاؤ۔ ہر تختے میں دو ایک تالاب یا ننھی جھیلیں ہیں۔ جن میں کنول یا کنول نما پودے تیرتے پھرتے ہیں۔ قسم قسم کے ملکی و غیر ملکی درختوں سے باغ آراستہ ہے آسٹریلیا افریقہ، جنوبی امریکہ، خطۂ بحیرہ روم یہاں ہمارے ملک میں ملک ملک کی پیداوار نشو و نما پا رہی ہے۔ ہر ایک کا اک جداگانہ نقشہ ہے۔ کوئی سیدھا اوپر کو نکل گیا ہے اور اپنے سر کے اوپر اپنا سبز جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے۔ کہیں مخروطی شکل کے نئے نئے سرو ہیں۔ کہیں ذرا پھیل کر شاخیں یوں نیچے کو جھک گئی ہیں جیسے شبِ برات میں کوئی انار چھوٹ رہا ہے۔ کہیں دیودار نے ہر کسی سے ملنے کو اپنے بانہیں پھیلا دی ہیں۔ کہیں نیلگری کے چمپا کلی پیڑ اپنے پھولوں

کے ساتھ اپنی مستی میں سایہ افگن ہے قسم قسم کے رنگ رنگ کے "پام" ہیں۔ سبز زرد ارغوانی ۔ کیا نوک پلک ہے اصاف ستھرے۔ تنے ایسے خوشنما گویا ابھی قطع و برید ہوئی ہے۔ نیچے گلزاروں میں اوپر درختوں میں رنگوں کی ہولی ہے۔ بیک وقت بسنت اور عید کا سماں ہے لیکن شوخی ہے خاموشی کے ساتھ اور رعنائی ہے متانت اور نزاکت کا پہلو لئے ہوئے بھینی بھینی خوشبوئیں طرح طرح کے رنگوں کے ساتھ چمن کے کونے کونے میں اپنے معصوم کھیل کھیل رہی ہیں دنیا بھی ایک بہشت ہے، اگر کسی کو دیکھنے کی تمنا ہو اور سیر کرنے کی فرصت!

ہمارا معمول تھا کہ ہم ہر روز گیارہ سے ایک بجے تک اس باغ میں جاتے۔ اس کے دھوپ سایوں سے محظوظ ہوتے اس کی خوشبودار ہواؤں میں چلتے پھرتے۔ کبھی یہ ہوتا کہ میں ادھر گھومتا اور درختوں کے نام پڑھ کر اُن سے تعارف حاصل کرتا اور بیگم اُدھر درخت کے نیچے لیٹی ایک کتاب پڑھتیں۔ پھر کبھی ہم ایک دوسرے کو کوئی ہلکا پھلکا مضمون پڑھکر سناتے اور کبھی ہم اوٹی کی تعریفیں کرنے لگتے گویا یہ سمجھتے اور پکارتے کہ ہم ان خوبصورتیوں کے دریافت کرنے والے بھی کس قدر قابل ستایش ہیں!

جنوبی ہند جھیلوں اور تالابوں کا خطہ ہے۔ یہاں کے دریا خشک ہو جاتے ہیں تو یہ ان کی جگہ آبپاشی کا کام دیتے ہیں مدراس میں بنگلور میں میسور میں سینکڑوں تالاب ہیں۔ اوٹی میں قدرتی جھیلیں ہیں۔ جس طرف سیر کو نکل جاؤ ایک چھوٹی سی جھیل میں گرد و نواح کے نظارے کا دلکش عکس نظر آتا ہے۔ آبشاروں کی بھی کمی نہیں۔ شمال کی طرف دریائے پائی کارا پہاڑوں کے اوپر بہتا ہوا ایک مقام پر آبشاروں کا ایک سلسلہ بناتا ہوا نیچے کی طرف گرتا ہے۔ جنوب میں "لیڈی کینگ کی نشستگاہ پر بیٹھو تو دائیں طرف ایک آبشار چٹانوں پر سر پٹکتا نظر آتا ہے۔ نیچے میٹوپالیم کا قصبہ ہے جو گویا اوٹی کا کالکا ہے۔ جہاں مدراس کی بڑی پٹڑی کی ریل ختم ہوتی اور اوٹی کی چھوٹی پٹڑی والی ریل اوپر کو آتی ہے۔ اس نشست گاہ سے جنوبی ہند کا کوسوں کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ تخیل میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا دور افق سے پرے راس کماری واقع ہے جو ملک کافور کی آخری منزل تھی اور جہاں ہمارے حسین و شاندار ملک کے قدموں میں دو سمندر لوٹتے ہیں!

علاوہ دلفریب مناظر کے اوٹی میں اور بہت سی تفریحات ہیں۔ جو سیاحوں وغیرہ کے لئے وجہ کشش ہیں۔ شیر چیتے کا شکار جنگلی پرندوں کا شکار مچھلی کا شکار۔ لومڑی کا شکار، گولف گھوڑ دوڑ، پولو۔ گرمیوں کے مہینے ان تفریحی تماشوں میں گذرتے ہیں۔ ہمارے حکمران خوب آدمی ہیں۔ نظم و نسق کے ماہر ہیں۔ اور سیر و تفریح میں مشاق!

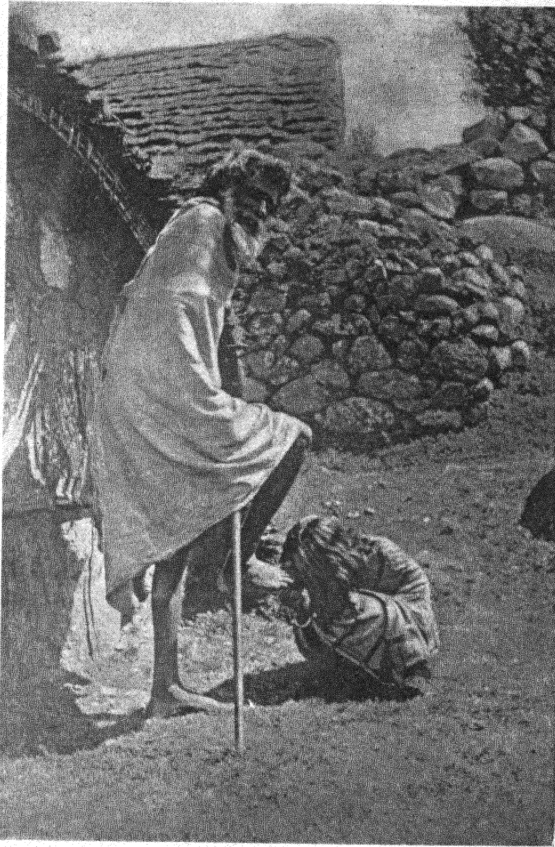
پیشتر اس کے کہ میں شمالی ہند کی طرف اپنی واپسی کا ذکر کروں۔ نیلگری کے کوہستان کی ایک عجیب و غریب قوم ٹوڈوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی شکل و شباہت میں جنوبی ہند کے باشندوں سے بلکہ شمالی ہند کے ہندوؤں سے بھی بالکل مختلف ہیں۔ ستواں اٹھی ہوئی ناک۔ لمبے چہرے، ڈاڑھیاں لٹکی ہوئی سر پر گوجروں کی طرح کے بال، قد لانبا۔ سینہ چوڑا چکلا، آنکھوں میں دلیری، پیشانی میں چمک! نہیں معلوم یہ کون لوگ ہیں۔ کونسی قوم ہیں۔ کہاں سے

HUMAYUN LAHORE.



ٹوڈوں کی بستی میں

HUMAYUN LAHORE,



نوقدرن کا سلام

آئے ہیں؟ سُنا ہے ان کی تاریخ کا ابھی تک ٹھیک پتہ نہیں چلا + ایک دن مارلی منڈ کی جھیل سے ہوکر ہمارا شوفر ہمیں اوپر کے پہاڑوں پرلے گیا اور وہاں ایک جگہ موٹر ٹھہرا کر ہمیں ایک ٹوڈا بستی میں لے گیا۔ چار پانچ جھونپڑیاں تھیں۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر چند مرد عورتیں اور ایک ننھی بچی باہر نکل آئے۔ اس بچی کا نام اکل یُوف تھا! اور عمر اس کی سات برس تھی۔ اپنی جھونپڑیوں میں یہ لوگ صرف ایک لنگوٹی پہنے رہتے ہیں۔ باہر مہذب دنیا میں نکلتے ہوئے ایک چادر اُوپر اوڑھ لیتے ہیں + ہم نے شوفر کی تامل کے ذریعہ ان سے باتیں کیں "تم کون ہو"؟ ہم برہمن ہیں (یہ غلط ہے) "کس چیز کی پوجا کرتے ہو"؟ انہوں نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے بہت چاہا کہ کچھ دے دلا کر مورتی دیکھیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ "کیا کھاتے پیتے ہو"؟ اپنی گایوں بھینسوں کا دودھ! یہ باتیں ہورہی تھیں کہ اتنے میں ان میں کا ایک بزرگ اِدھر آیا۔ ایک عورت اس کی طرف لپکی۔ اس نے ایک پاؤں زمین سے اٹھایا۔ عورت نے یہ پاؤں اپنے ماتھے سے لگایا، یہ کیا تھا؟ یہ سلام تھا عورتوں کا مردوں کو! ــــــــ اس کے بعد اے عورت کیا تم کہہ سکتی ہو کہ ہم مہذب مردوں نے تم کو مساوات عطا نہیں فرمائی؟

اُوٹی سے بنگلور ہوتے ہوئے ہم حیدرآباد جا پہنچے + مدت سے خواہش تھی کہ جنوبی ہند کی اس سرزمین کی زیارت کریں جہاں مسلمانی تدبر اور ہندوانی محنت کا اتحاد ہے۔ مغلوں کے زمانے کی سب سے زبردست زندہ یادگار کو اپنی آنکھوں دیکھیں۔ جامعۂ عثمانیہ کے اس گہوارے میں ہم بھی دو چار دن اپنا جھولا جھول لیں + ریاست میسور سے ریاست حیدرآباد میں آئے یعنی شام کو سانپ نما سنہری پگڑیاں نظر آتی تھیں صبح کو سرخ رُومی ٹوپیاں دکھائی دینے لگیں۔ دہلی۔ بمبئی۔ مدراس میں غیر ملکی ولائتی انگلستانی ہندوستان تھا۔ میسور اور حیدرآباد میں ملکی دیسی ہندوستان نظر آیا۔ ان دو ریاستوں سے ظاہر ہوا کہ ہندو اور مسلمان خود اختیاری حکومت میں کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ ان دونوں کے عیوب و محاسن کی عملی شکل نظر آگئی۔ مسلمان میں نظم و نسق کی صفت پائی جاتی ہے۔ ہندو میں محنت کا جوہر۔ مسلمان میں شائستگی ہے ہندو میں استقلال!

حیدرآباد میسور سے زیادہ خشک اور گرم خطہ ہے۔ اس کی سطح کی بلندی بھی کم ہے۔ شمالی حصہ مرہٹواڑہ اور جنوبی حصہ تلنگانہ کہلاتا ہے وہ زیادہ ہموار اور زرخیز ہے۔ یہ زیادہ پتھریلا ہے۔ اُس کی زبان زیادہ مرہٹی ہے اس کی تلیگو۔ حیدرآباد اور اردو میں گویا ان متضاد عناصر کا ملاپ ہے۔ کل آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ جس میں ایک کروڑ بیس لاکھ ہندو ہیں اور پونے سولہ لاکھ مسلمان + تاریخ میں سب سے پہلے اس خطۂ ملک میں آندھرا قوم کی بادشاہت کا ذکر میگاستھینز نے کیا ہے۔ پھر یہاں اشوک کا قدم آیا۔ پھر چلوکیہ خاندان کا تسلط ہوا۔ جن کی یادگار اجنٹا کے غار ہیں۔ پھر ۷۵۰ء سے دو صدیوں تک راشٹرکٹ خاندان نے حکومت کی۔ جس کی غیر فانی یادگار ایلورا کے غاروں میں کیلاس کا مندر ہے۔ پھر چلوکیہ کلاچوری ہریسلا وغیرہ خاندانوں کے بعد تیرھویں صدی کے آخر میں یہاں اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ خلجی اور تغلق خاندانوں کے زوال کے بعد شاہانِ بہمنی نے یہاں ایک خود مختار حکومت قائم کی جو دو صدیوں تک برقرار رہی۔ ایک وقت میں اس

حکومت کا پھیلاؤ مشرقی ساحل سے مغربی ساحلِ ہند تک تھا۔ لیکن اُدھر مغل ہندوستان میں آئے۔ اِدھر اس حکومت کے کھنڈروں پر برار کی عماد شاہی بیجاپور کی عادل شاہی بیدر کی برید شاہی احمد نگر کی نظام شاہی اور گول کنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ وہ احمد نگر ہی کی چاند بی بی تھی جس نے اُدھر اکبر کے لشکر کا مقابلہ کیا۔ اور اِدھر ان تمام جنوبی اسلامی ریاستوں میں اتحاد پیدا کر کے تلی کوٹ کے مقام پر ۱۵۶۵ء میں وجیانگر کی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا + قطب شاہی سلطنت حیدر آباد سے پانچ میل کے فاصلے پر گول کنڈے میں مسلط تھی۔ اورنگ زیب نے یہاں کے حکمران تاناشاہ کو حکم بھیجا کہ وہ اپنے برہمن وزیر کو جس نے مرہٹوں سے سازش کی تھی برطرف کر دے۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر مغل فوجیں دکن کی طرف بڑھیں، پہلے حیدر آباد کو (جس کی چوتھے قطب شاہی بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے بنیاد ڈالی تھی) فتح کیا اور پھر آٹھ ماہ کے شدید محاصرہ کے بعد گول کنڈہ کو سر کیا گیا + لیکن مغلِ اعظم کی وفات کو پچاس برس بھی نہ گزرے تھے کہ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کا ادبار شروع ہوگیا۔ مرہٹے، انگریز، فرانسیسی ہر دبی ہوئی قوم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور وسطی و جنوبی ہند میں رقابتوں، لڑائیوں اور فتنہ انگیزیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس حالت میں مغل سلطنت گو جنوب میں قائم نہ رہی لیکن اس کے ایک دور اندیش قائد و مدبر نظام الملک نے مغلئی جھنڈا بلند کیا۔ اور آج تک یہ زبردست ریاست مغلوں کے عہد کی یادگار بنی چلی آتی ہے +

جس روز ہم میسور سے رخصت ہوئے سہ پہر کی ایک پارٹی میں ایک پارسی نے یہ دریافت کر کے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں حیدر آباد کے متعلق کہا کہ حیدر آباد ایک حیرت انگیز مقام ہے۔ وہ یقیناً منطقی طور پر ہندوستان کا دارالسلطنت ہے۔ لیکن دو تین روز میں اس کی خوبی و عظمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہم وہاں صرف چار روز ٹھہر سکے اور اپنے میزبان پروفیسر شروانی کے ذریعے سے ہم نے پچاس ساٹھ گھنٹوں میں امریکی سرعت کے انداز میں بہت سے مقامات کی سیر کی اور بہت سی دل پذیر شخصیتوں سے تعارف حاصل کیا +

حیدر آباد جو ہندوستان کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ کم و بیش پندرہ میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ اصلی قدیم شہر مُوسی ندی کے اُوپر اس کے جنوب کی طرف واقع ہے (موسی کا تلفظ مُوسی ہی ہے موسیٰ نہیں۔ بقول ایک حیدر آبادی کے اگر دریا ہوتا تو موسیٰ ہوتا۔ ندی ہونے کے باعث صرف موسی ہے) جدید آبادی ندی کے شمال کی طرف ہے۔ یہاں ہر طرزِ تعمیر کے خوشنما بنگلے ہیں۔ جو میلوں کے نشیب و فراز میں دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ ہندوستان کے جتنے میدانی شہر ہم نے دیکھے ہیں ان میں سے کسی شہر میں اس قدر نشیب و فراز کا لُطف نہیں جتنا حیدر آباد میں اور پھر تالاب اور چھوٹی جھیلیں اس اونچ نیچ میں گویا جا بجا اس فطری حسن کی آئینہ دار بن رہی ہے + حیدر آباد ایک وسیع خوبصورت شہر ہے۔ لیکن آئندہ چار پانچ سال میں اس کی ترتیب و خوبصورتی میں بہت کچھ اور ترقی ہونے کے آثار نظر آتے ہیں۔ حیدر آباد کچھ بنا ہوا ہے اور کچھ جا بجا بن رہا ہے۔ کہیں نئے مکان اور نئی سڑکیں بن چکی ہیں۔ کہیں پرانے مکان گر رہے ہیں اور پرانی سڑکیں چوڑی کی جا رہی ہیں (نئی نظام سڑک ۱۲۰ فٹ چوڑی ہے)

قدیم شہر کے عین مرکز میں چار مینار کا شاندار چوک ہے جس سے چاروں طرف سڑکیں نکلی ہیں۔ قریب ہی مکہ مسجد ہے۔ یہ قطب شاہی عمارات ہیں۔ ان میں خوبصورتی کے ساتھ سادگی اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔ اور ایک قسم کے عزم و استقلال کا اظہار ہے۔ چوک سے کچھ دور ندی کے کنارے عدالت العالیہ کی پُر رعب خوشنما عمارت ہے۔ یہاں اربابِ عدالت نے ہمیں اپنی مہمان نوازی و خوش اخلاقی سے ممنون فرمایا اور ہم نے اُن کی خاموش قانونی کارگذاری اور عدل گستری کی ایک جھلک دیکھی۔ ندی کے پار جنرل ہسپتال اور عثمانیہ پارک کا دلفریب دریائی چمنستان واقع ہے۔ یہاں ہم ایک پارٹی میں شریک ہوئے۔ جس میں حیدرآباد کے اکثر عمائد اور ارکانِ حکومت شامل تھے اور گذشتہ مغلئی شائستگی کی ایک چھوٹی سی دلکش تصویر نظر آتی تھی۔

ارکانِ علم و ادب اور اربابِ حل و عقد کے اس دل نواز مجمع کی یاد مدت تک باقی رہیگی جس میں ہز ایکسیلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد، نواب میرزا یار جنگ، نواب ناظر یار جنگ، جسٹس بشیشور ناتھ، خان فضل محمد خان، نظامت جنگ بہادر، ذوالقدر جنگ بہادر اور ادبا میں اختر مینائی (خلف الرشید امیر مینائی) مولوی عبدالحق، سید شبیر حسن جوش اور میرزا فرحت اللہ بیگ سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا۔

عدالت العالیہ کے ممبر مجلس میرزا یار جنگ بہادر نے عدالت العالیہ کے ارکان سے ہمارا تعارف کراتے وقت مسکرا کر کہا کہ یہاں ہر شخص کے نام میں لفظ "جنگ" ہے۔ گویا ہم میں صلح نہیں رہتی بلکہ ہر وقت جنگ برپا ہے۔ حیدرآباد میں آکر اجنبی پہلے پہلے ان پُر رعب ناموں کے نیچے گویا دب جاتا ہے۔ "جنگ" "دولہ" "ملک" "سلطنت" "جاہ" کیسے لطیف و پُرشوکت خطابات ہیں اور "جنگ" بھی کچھ ایسا درشت نہیں کیونکہ عموماً اِس کے ساتھ "یار" کا مددگار شامل ہوتا ہے۔ مثلاً جنابِ الف اور بے یہ خطاب پاکر الف یار جنگ اور بے یار جنگ ہو جاتے ہیں!

ادب آفرینی کی کئی اور چھوٹی چھوٹی مثالیں حیدرآباد میں ملتی ہیں۔ مثلاً چوراہا۔ احتیاط۔ سہ راہا۔ خطرہ"۔ اس کے ساتھ نفاست ہے جو لباس و گفتگو میں عیاں ہے اور نزاکت کا یہ حال ہے کہ ہم نے کسی بھلے مانس کو پیدل قدمی کرتے حیدرآباد میں نہ دیکھا۔ شاید یہ وہاں کی وضعداری کے خلاف ہے۔ علم ادب اور فنونِ لطیفہ سے فضلا و ادبا بلکہ امرا کو بھی خاص شغف ہے۔ مشہور دہلوی ادیب آغا حیدر حسن کے ادب و مصوّری کے ذخیرے کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ان کے پاس بعض نایاب مسودات ہیں۔ ایک کتاب میں زیب النساء کی دستخطی تحریر تھی۔ آغا صاحب نے اپنا سارا سرمایہ ایسی کتابوں اور تصویروں کے حصول میں صرف کر دیا ہے۔ لیکن جب ہم مجھے نواب سالار جنگ کے پاس لے گئے تو تصویروں، کتابوں، مجسّموں اور دیگر خوبصورت چیزوں کے بے بہا خزانوں کو جو کہیں وسیع ایوانوں اور کہیں بند کمروں میں بھرے پڑے ہیں دیکھ کر میں مبہوت و حیران ہو گیا۔ آج تک کسی شخص کے پاس میں نے اتنا اور ایسا بیش

قیمت علم وفن کا ذخیرہ نہیں دیکھا۔ بغداد و قرطبہ کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا مطلا مصحف دیکھا۔ محنت و ایمان کی تصویر نظر آگئی +

علاوہ مذکورہ بالا مقامات کے زنانہ عثمانیہ کالج اور حبیبیہ سکول جن میں تقریباً ۵۰۰ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں، طبیہ کالج کتب خانہ، دار العجائب، باغ عام اور حسین ساگر اور شہر سے دور حمایت ساگر اور عثمان ساگر کے بے نظیر وسیع تالاب جو علاوہ منظر نمائی کے آب رسانی و آبپاشی کے کام آتے ہیں یہ اور اور بہت سے قابل دید ادارات و مقامات ہیں جن سے حیدرآباد آراستہ و پیراستہ ہے اور جن کے ذکر کو ایک مستقل مضمون درکار ہے + وہ مقام جس سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا گولکنڈہ تھا۔ حیدرآباد سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ٹیلوں اور پہاڑوں اور وادیوں سے گھری ہوئی ایک بلند تر پہاڑی ہے۔ جس کی گھاٹیوں میں کبھی گولکنڈے کا متمدن قطب شاہی شہر آباد تھا۔ عین چوٹی پر بالاحصار کا شاہی قلعہ اور قصر پُر عظمت تھا۔ بالاحصار جس کی بلندی پر اب بھی بیسیوں محلات کے کھنڈر اور ایک ایوان قائم ہے، فی الحقیقت ایک بے مثال جگہ ہے۔ شمال جنوب مشرق مغرب ہر طرف پچاسوں میل کا نظارہ قدموں میں لوٹ رہا ہے۔ عین بیچ میں یہ شاہانہ پہاڑی قائم ہے اس کے ارد گرد شہر کی فصیل ہے۔ شہر کے اندر اور اُوپر قلعہ ہے۔ قلعے کے اندر اور اُوپر شاہی محل ہے اور یہ ایک ایوان بالاترین۔ جدھر نگاہ اٹھاؤ ٹیلے ہیں اور وادیاں اور چٹانیں اور دائیں طرف کو حمایت ساگر اور عثمان ساگر کے پانی جھلکتے ہیں اور بائیں طرف کو حیدرآباد کے مکان اور مینار + آج یہ منظر سامنے ہے۔ ڈھائی سو سال ہوئے ایک اور منظر تھا کہ دور نیچے عین سامنے اورنگ زیب کا جرار لشکر پڑا تھا۔ آٹھ ماہ تک اُدھر سے گولہ باری ہوتی رہی اِدھر سے جواب ملتا رہا۔ سلطنتوں کی ٹکر تھی! آخر قوی نے کمزور کو نگل لیا۔ صدیاں ہوئیں یہ کچھ ہوا۔ اب سے صدیوں کے بعد خدا جانے کیا کچھ ہوگا۔ کون کمزور ہوگا اور کون قوی۔ قومیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ یہ انسان کی تاریخ ہے اور اس کی قسمت صرف وادیاں اور پہاڑیاں اور چٹانیں شاید کروڑوں سال تک جوں کی توں قائم رہتی ہیں!

جس طرح یہاں کے مقامات میں یہ مقام عبرت انگیز ہے اُسی طرح یہاں کے ادارات میں جامعۂ عثمانیہ ایک امید افزا ادارہ ہے + انگریز ہمارے ملک میں آئے۔ ایک گرتی ہوئی تہذیب کے کھنڈروں میں اُنہوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ ہم نے انہیں کی زبان میں پھر بولنا سیکھا لیکن جب پھر بولنا سیکھا تو سمجھے کہ بولنے اور سمجھنے کے لئے اپنی ہی زبان زیادہ موزوں ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس خیال کی عملی شکل ہے + میں نے ایک دن صبح کے چند گھنٹوں میں یکے بعد دیگرے طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر وہاں کے بعض پروفیسروں کے لیکچر سُنے اور گو یہ تحصیلِ علم ہر علم سے صرف چند منٹ مستفید ہونا تھا مگر اتنی قلیل مدت میں بھی مجھے صاف صاف اندازہ ہو گیا کہ معلم جتنی آسانی سے ادق سے ادق مطالب کو ادا کرتا ہے متعلم بھی اُتنی آسانی سے اُنہیں سمجھ لیتا ہے۔ ہند کی تمدنی تاریخ، جاپان و انگلستان کے دستورِ اساسی طبیعیات کے "ارتعاش" و "انحراف" و "انعطاف"۔ ریاضی کے ؔ اور ؔ غرض ایک نری انگریزی پڑھے ہوئے کے لئے ہماری عزیز اُردو کے

خاصے حیرت انگیز کرشمے عمل میں آرہے تھے۔ اللہ کرے زورِ عمل اور زیادہ!

عثمانیہ یونیورسٹی جو یکم محرم ۱۳۳۷ھ (مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء) کو قائم کی گئی۔ چار کالجوں اور چار انٹرمیڈیٹ کالجوں پر مشتمل ہے۔ عثمانیہ کالج میں تقریباً سوا پانچ سو طلبہ ہیں۔ جامعہ کا سالانہ میزانیہ تقریباً سترہ لاکھ روپیہ ہے۔ اس میں علاوہ عام علمی ادبی و طبیعی مضامین کے ڈاکٹری، انجینیئری، علمی اور قانون وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ دارالترجمہ نے تاحال کل تین سو اکسٹھ کتابیں تیار کی ہیں جن میں سے دو سو دو طبع ہو کر درسی کتب کا کام دے رہی ہیں +

اس وقت جامعہ کا مسکن عارضی ہے لیکن اس کی نئی عظیم الشان عمارات کی بنیاد اسی ماہ میں رکھی جانے والی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ چار سال میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ شہر کے جنوب مشرق کی طرف آبادی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک غایت درجہ خوش منظر مرتفع مقام ہے۔ جہاں کی ہوا لطیف و روح پرور ہے اور جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں اور ہر طرف کوسوں کا نظارہ ہے۔ یہاں پندرہ سو ایکڑ زمین علیحدہ کردی گئی ہے۔ یہ ہماری ملکی و قومی زبان کی ہونہار جامعہ کا گہوارہ ہے۔ علم و ہنر کے لئے ایسی ہی فضا ہونی چاہیئے۔ وسیع آزاد، منظر آفریں!

اوپر شمال کی طرف گول کنڈے کے کھنڈر ہیں اِدھر جنوب کی طرف جامعہ عثمانیہ کی بنیادیں کھُد رہی ہیں۔ بیچ میں حیدرآباد کا شہر ہے، جو گویا ان قدیم و جدید تہذیبوں کا ماویٰ و ملجا ہے۔ اعلیٰ حضرت حضورِ نظام مشرق و مغرب کی اس متحدہ قوت کے رہنما ہیں+ حیدرآباد میں زیادہ تر یا قطب شاہی دور کی عظمت پر تو افگن ہے یا عثمانی عہد کی تعمیر و تنظیم ہویدا ہے۔ عمارتیں، باغات ادارات اکثر میں موجودہ شہر یارِ دکن کی شہر آرائی و علم پروری کی مُہریں ثبت ہیں+ ایک جمعے کے روز دوپہر کے بعد ہم باغ عامہ کے نزدیک اپنی موٹر میں گذر رہے تھے کہ پولیس والے نے سیٹی دی۔ ہم نے موٹر ٹھہرائی تو معاً باغ کے بابِ داخلہ سے تین چار موٹریں ایک دوسرے کے پیچھے ہوتی ہوئی نکلیں۔ سامنے کی موٹر میں ایک سادہ لباس شخص عینک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی نظروں سے ذکاوت و فطنت عیاں تھی۔ گزر جانے پر معلوم ہوا کہ یہی حضورِ نظام ہیں۔ ہر جمعے کے روز باغ عامہ کی اس چھوٹی سی خوشنما مسجد میں آتے ہیں اور اپنی مملکت کے غریب سے غریب آدمی کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز جمعہ ادا کرتے ہیں+

جنوبی ہند کی سیر ختم ہوئی۔ ہمارے ملک کے جنوبی حصے میں بھی جسے اکثر شمالی بھائی ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں کیا کیا قدرتی مناظر ہیں۔ کیسے کیسے تمدنی ادارات ہیں کیسی کیسی حیرت انگیز شخصیتیں ہیں۔ شمال کی بہ نسبت جنوب میں ہندوانی تمدن اور مسلمانی تمدن اپنے اصلی رنگ میں زیادہ اچھی طرح نظر آتا ہے!

بشیر احمد

رنگ بسنتی چھائے

کھیتوں میں زرد زرد سرسوں پھولی ہے بسنتی رنگ چھایا ہے اور کنارے کنارے زعفرانی رنگ کے کسم کے پھول گوٹ کی طرح ہیں۔ اس وقت ایک حسینہ تھالی میں پھول لئے چھم چھم کرتی ہوئی مندر جاتی ہے کیا اچھا وقت ہے یہ وقت ہمیشہ نہیں آتا۔ وہ حسینہ مندر میں دعا مانگتی ہے کہ یا خدا میری دولت دگنی ہو جائے۔ میرا حسن میرے شوہر کو بھلا معلوم ہو اور اولاد سے میری گود بھر جائے۔ وہیں ایک عاشق زار بھی ہے جو یہ دعا مانگتا ہے کہ خدایا محبت کو ایک زمانہ ہو گیا ہے مگر محبوب مہربان نہیں ہوا۔ غرض ہر کوئی اپنی اپنی سناتا ہے۔ اس کے بعد شاعر دعا مانگتا ہے کہ خدایا مجھے اپنا بنا لے۔

کھیتوں کھیتوں پھولی سرسوں رنگ بسنتی چھائے

پھول کسم[1] کے کھیت کنارے کیسر[2] گوٹ[3] لگائے

اسی سمے اے پریمی من کو پریم کی بات سہائے[4]

پھولی سرسوں آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

تھال میں پھول اور پات لئے کوئی سُو[5] نے مندروا جائے

چھمک[6] چھمک چل چھپ دکھلاوے پتھر کو نرمائے

سکھ آنند[7] سمے سمپورن پھر یہ سمے نہ آئے

پھولی سرسوں، آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

آسا[8] میری سُن لو سوامی[9] دھن دونی ہو جائے

اور یہ شوبھا مورپتی[10] کی آنکھوں میں کھپ جائے

اور اے سوامی ابھی آؤں بالک[11] گلے لگائے

[1] گُل خرطم جو کھیت کے کنارے ہوتے ہیں [2] زعفرانی رنگ کی گوٹ [3] مرغوب ہوتی ہے [4] سنسان [5] پیروں میں زیور کی آواز چھپ معنی ادا [6] یعنی خوشی کا وقت غنیمت ہے [7] مراد [8] پرماتما [9] شوہر [10] یعنی صاحب اولاد ہو جاؤں۔

پھولی سرسوں، آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

کوئی کہے اے سوامی مجھ کو گیان[11] کی بات نہ بھائے
برس دنا ہونے کو آئے شیام سے پریت لگائے
کب تک راکھوں من کو اپنے سوامی جی سمجھائے

پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

جو ہے اپنی کتھا سنائے اپنی اپنی گائے
دیکھوں سوامی کسے سراہیں[12] کوی[13] کا من للچائے
سوامی جی میری بھی سُن لو ہیں بھی آس لگائے

پھولی سرسوں، آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

پوت سپوت[14] نہ مانگو سوامی، مایا مجھے نہ بھائے
اس جگ کی سب شوبھا جھوٹی اس پر دھیان نہ جائے
اپنا مجھے بنا لو سوامی رووٗں سیس[15] نوائے

پھولی سرسوں، آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

سید مقبول حسین احمد پوری

---

[11] عقل [12] سرفراز کریں [13] شاعر [14] لائق اولاد [15] سر بسجدہ ہو کر۔

راگ کا جادو

گانا ہو رہا تھا یعنی سروں کا وہ دلیا جو گول کمروں میں نکیلی شکلیں رسیلے نینوں کی مدد سے طیار کرنے میں ماہر ہیں پک رہا تھا۔ یوں تو آواز بھی تھی، ساز بھی تھا مگر راگ کچھ ایسی گہری نیند سویا تھا کہ بیدار نہ ہوا پر نہ ہوا اور پھر ....

جس طرح کسی رشکِ گل کی آمد سے مجلس کا رنگ بدل جاتا ہے یعنی باچھیں کھلتی ہیں قہقہے اڑتے ہیں، فقروں میں شعریت اور آنکھوں میں تبسم رواں ہوتا ہے اسی طرح مسز مکرجی (یہ نام اصلی ہے) کے دو بول ابھی ہوئے ہی تھے کہ محفل بدل گئی جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ مگر سر تھے کہ جھوم رہے تھے، دل تھے کہ تڑپ رہے تھے۔

اصرار میں، بالخصوص غیر ضروری پر تکلف اصرار میں اہلِ ہند ماہر ہیں مگر واہ رے راگ کے جادو! دیر تک کسی میں یہ جرأت نہ ہوئی کہ مسز مکرجی سے "ایک اور" کی فرمائش کرتا۔ اور واہ رے راگ کے جادو! وہ عورتیں جن کی زبان پل بھر کے لئے برسوں سے نہ تھمی تھی وہ بھی دم بخود تھیں۔

سحرِ بنگالہ کا یہ الٹا اثر ہوا کہ میں ہند میں بیٹھا تھا پیرس پہنچا۔ آنکھوں کے سامنے وہ تمام سین پھر گیا جب پیرس کی ایک مشہور فتنہ زا تنہا سٹیج پر گا رہی تھی اور چار ہزار سامعین

"سر خود نہادہ برکف"

دنگ تھے

فلک پیما

حیوانات کی قوتِ شامہ

حیوانات کی قوتِ شامہ حیرتناک طور پر تیز ہوتی ہے۔ کتے پہ نظر ڈالئے۔ بہ نسبت اور حیوانوں کے یہ اپنی سونگھنے کی طاقت سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ راہ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتا چلتے چلتے سونگھتا جاتا ہے، پھر آگے پاؤں اٹھاتا ہے۔ کتوں میں بھی مختلف اصناف ہیں اور اسی نسبت سے قوتِ شامہ کے بھی ان میں مختلف مدارج ہیں۔ یہ حس سب سے زیادہ قوی بلڈ ہاؤنڈ میں ہوتی ہے چنانچہ قدیم ایام سے اس ذات کا کتا مفروریں اور مجرموں کی سراغ رسانی کے کام پر مقرر کیا جاتا ہے۔ مفرور بھاگنے کے بعد اپنی جو مخصوص بو چھوڑ جاتا ہے اس کا بجز ہاؤنڈ کے کوئی پتہ نہیں لگا سکتا بعینہ اسی طرح مقتول کے خون کی بُو اسے فی الفور معلوم ہو جاتی ہے اور وہ ٹھیک مقام پر پہنچ کر اس کا پتہ لگا دیتا ہے کہ اس کی لاش کہاں مدفون ہے ہم ایک دو بوند لہو اور وہ بھی خشک شدہ اگر دیکھیں تو کچھ نہیں بتا سکتے لیکن یہی خشک شدہ قطرے شکاری کتے کے لئے سراغ رسانی کا پورا ثبوت ہوتے ہیں اور وہ زخمی ہرن کا کھوج لگا لیتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کتا اندھا ہو بھی جائے اور اس کی باصرہ بالکل زائل ہو جائے یا چھچھوندر کی طرح قلتِ بصر اُسے لاحق ہو جائے تاہم وہ اپنی شامہ کی بدولت اپنے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کلکتہ میں چند ہاؤنڈ لائے گئے تھے اور انہیں خفیہ پولیس کے زیرِ تربیت رکھا گیا تھا۔ تمام مہذب ممالک میں اب بھی کتے پالے جاتے ہیں اور ان سے محکمہ تفتیشِ جرائم حیرت ناک فائدے اٹھاتا ہے۔ نہ محض خون کے نشانات سراغ رسانی میں ان کتوں کی رہبری کرتے ہیں بلکہ مجرم اور مفرور کے قدموں کے نشانات کی مخصوص باس سونگھتے سونگھتے یہ اس کے پاس جا پہنچتے ہیں بلڈ ہاؤنڈ سبک رفتار نہیں ہوتا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ اور سونگھ سونگھ کر چلتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر اسے کہیں مغالطہ ہو جاتا ہے۔ قدموں کے نشان کی بو صاف نہ محسوس ہو یا راہ بھول جائے تو از سرِ نو اپنا تحقیقاتی سفر اسی جگہ سے شروع کرے گا جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ مسٹر کے ابن متر نے اپنی کتاب "قلب ماہیت" میں کتوں کی محیر العقول شامہ کی نسبت کچھ تجربات درج کئے ہیں انہوں نے اپنے پالے ہوئے کتے کو گھر میں باندھ دیا اور دیگر دو دوستوں کی معیت میں گھر سے روانہ ہوئے اثنائے راہ میں یہ معمول رہا کہ وہ جب آگے بڑھتے تو ان کے نقشِ قدم پر دوسرا پھر تیسرا دوست پاؤں رکھتا۔ اسی طرح وہ ایک سہ راہے پر پہنچے وہاں ہر ایک دوست نے اپنا اپنا راستہ اختیار کیا، اس کے بعد کتا آزاد کیا گیا۔ وہ پراسرار طریقے پر سہ راہے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہی راستہ اختیار کیا جدھر اس کے آقا نے چلنا شروع کیا تھا۔ دیکھا گیا کہ کتا تھوڑی دیر میں اپنے آقا کے قدموں

میں لپٹ گیا ہے! واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ محض پیروں کے نشان پہچان لیتا ہے بلکہ اپنے آقا کے کپڑوں کی باس سونگھ لیتا ہے اور آناً فاناً بڑے بھاری مجمع میں سے اسے نکال لیتا ہے۔

پرندوں میں سب سے زیادہ تیز گدھ کی قوتِ شامہ ہوتی ہے۔ علمائے حیاتیات نے گدھ کی قوتِ شامہ اور قوتِ باصرہ پر گرما گرم بحث کی ہے۔ ایک فریق کا خیال ہے کہ باصرہ زیادہ تیز ہے اور دوسرے کا قول ہے کہ شامہ سے وہ مدد لیتا ہے لیکن میرے خیال میں موخر الذکر صحیح ہے۔ گدھ محض باس سونگھ کر اپنے شکار پر پہنچتا ہے۔ اگر اول الذکر کا خیال صحیح ہوتا تو ان گھنے جنگلوں میں جہاں آفتاب کی صورت تک نظر نہیں آتی جب جانور مر جاتے ہیں تو گدھ کس طرح پہنچ جاتے ہیں اُن کا فضائے بسیط میں قلابازیاں کھانا کسی طرح شکار کی دستیابی میں ان کا معاون نہیں ہوتا غور کرو کہ سب سے پہلے متعفن لاش پر کوے پہنچتے ہیں۔ ان کی کائیں کائیں سن کر چیلیں جھپٹا مارتی ہیں پھر کہیں گدھ اترتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب تعفن حد درجے کا پیدا ہو گیا ہو۔ تازہ گوشت پر گدھ نہیں آتے۔ گدھ کی شامہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ نہ محض تعفن محسوس کر لیتا ہے بلکہ اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس سمت سے اور کتنی دور سے بدبو آ رہی ہے۔

ایک دن میں نے اپنے گاؤں کے باہر درخت پر ایک گدھ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جب ہوا تیزی سے چلنے لگی تو گدھ بے اختیار چاروں طرف گردن نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ بالیقین وہ کوئی بو محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مغرب کی جانب اڑ گیا۔

قوت شامہ اور باصرہ کے مابہ الامتیاز فرق کو سمجھانے کے لئے زیادہ وضاحت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعفن کے ذرات گرد و غبار کے ساتھ اڑ سکتے ہیں یا نہیں۔ ۱۸۷۲ء میں سوویس کے کوہ آتش فشاں سے خاکستر کے ذرات اڑ کر ترکستان کے صدر مقام قسطنطنیہ میں پہنچے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں گیری کے کوہ آتش فشاں کا غبار سمندر پار کر کے شمالی افریقہ کے ٹریپولی میں پہنچا تھا۔ ۱۸۴۵ء میں جزیرہ آئس لینڈ کے کوہ ہلاکا کے آتش فشاں سے جو غبار اٹھا تھا وہ اسکاٹ لینڈ کے ایک حصے میں دس گھنٹوں کی مسافت کے بعد آ کر گرا تھا۔ بدبو خوشبو کے ذرات بہت لطیف ہوتے ہیں پھر وہ زیادہ دور تک کیوں نہ پہنچ سکتے ہوں گے جب کہ ریگ، غبار اور خاکستر کے کثیف ذرات پہنچ جاتے ہیں! پس ثابت ہوتا ہے کہ گلے سڑے گوشت کی بدبو کے ذرات غبار اور خاکستر میں مل کر دور تک پہنچ جاتے ہیں اور گدھ انہیں سونگھ کر اسی رخ روانہ ہوتا ہے۔ نیز عام پرندوں میں بھی قوتِ شامہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ اگر کسی پرند کے گھونسلے میں انڈے رکھے ہوں اور کوئی شخص پرندوں کی عدم موجودگی میں انڈوں کو ہاتھ لگائے تو پرند واپس آ کر انڈے پر انسانی ہاتھ کی بو محسوس کر لیتا ہے اور پھر ان انڈوں پر نہیں بیٹھتا۔

ریگستان کے اونٹ کو قدرت نے ایسی قوتِ شامہ عطا کی ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ اونٹ کی قوت شامہ سے متعلق مشاہدات بہت حیرت خیز ہیں۔ پانی میں کسی قسم کی باس نہیں ہوتی لیکن وہ بہت دور سے پانی کی باس سونگھ لیتا ہے،

بالخصوص موسم گرما میں اس کے نتھنے پھول جاتے ہیں اور ہوا کی سمت اس کا منہ رہتا ہے اور بار بار وہ اس طرح سانس لیتا ہے گویا پانی کی باس لے رہا ہو۔ اکثر اوقات ساربان جب قلتِ آب سے بے تاب ہوتے ہیں تو اونٹ کی قوتِ شامہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اونٹ چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ بہت دور سے پانی کی باس سونگھ کر ایسی جگہ جا کر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں ذرا سی ریت اور مٹی ہٹانے سے پانی نکل آتا ہے اونٹ کی ذکاوت کے اور بھی بے شمار تجربات سیاح بیان کرتے ہیں

شتر گاؤ کی طرح اونٹ بھی خاموش جانور ہے، لیکن جب وہ مستی میں آتا ہے تو بلبلاتا ہے اور اس کے جسم سے مخصوص بو نکلنی شروع ہوتی ہے جسے ہم محسوس نہیں کر سکتے لیکن مادہ شتر محسوس کر لیتی ہے اور اس بو کی مقناطیسی قوت اسے نر کے پاس پہنچا دیتی ہے۔

افریقہ کا شتر مرغ اور کالا ہرن اتنے ہوشیار جانور ہیں کہ بہت دور سے شکاری کی بو پا لیتے ہیں۔ اور جس سمت سے شکاری آتا ہو تاڑ کر فی الفور کسی دوسری سمت نکل جاتے ہیں، شکاریوں کو اس کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ بھی ان جانوروں کی فطرت سے واقف ہو کر طرح طرح کے داؤ گھات برتتے ہیں، نہ محض شتر مرغ اور کالا ہرن بلکہ تمام جانور اپنے دوست اور دشمن کی بو سونگھ لیتے ہیں۔

میں شکار کی غرض سے ایک دفعہ بیل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ایک جگہ بیل چمک اٹھے۔ ہر چند گاڑیبان نے چلانا چاہا لیکن بیل ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں بیل گاڑی چھوڑ کر روانہ ہوا۔ چند فرلانگ پر جا کر دیکھا کہ ایک شیر صاحب عین سڑک کے وسط میں رونق افروز ہیں۔

سر ایس ڈبلیو بیکر نے کتاب موسومہ (The Wild Beasts) میں اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں۔ انہوں نے افریقہ کے جنگلی ہاتھیوں کی قوت شامہ کے حیرتناک حالات تحریر کئے ہیں۔ ان کے بقول ہاتھی بہت لطیف مزاج جانور ہے جس طرح اور چوپائے ہر قسم کی گھاس، ہر قسم کے پتے چٹ کر جاتے ہیں وہ اس کے برخلاف عمل کرتا ہے۔ اسے کسی خاص درخت کی محض چھال پسند آتی ہے، کسی کی جڑ، کسی کی ٹہنی، کسی کے پتے، کسی کے پھل، کسی کے پھول، یہ بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ شب بیدار جانور ہے۔ ایسے جنگلوں میں جہاں دن کو بھی روشنی نہیں ہوتی ظلمت شب میں ہاتھی محض قوتِ شامہ کی مدد سے اپنا رزق تلاش کر لیتا ہے۔ ایک ہزار گز کے فاصلے سے ہاتھی کو اپنے دشمن کی بو آ جاتی ہے۔ اس لئے افریقہ میں ہاتھی کا شکار بہت مشکل ہوتا ہے۔

بلی کی خاصیت ہے کہ وہ دودھ، گوشت اور مچھلی تک کی پہلے باس لے لیتی ہے۔ اکثر اوقات بچے شرارت کرکے چھیچھڑے کسی شے کے نیچے ڈھک دیتے ہیں اور جب بلی آتی ہے تو دیوانہ وار ارد گرد طواف کرتی ہے، سر گرداں ہے اور چلاتی ہے۔ گویا خوشامد کرتی ہے کہ میں نے بہت دور سے چھیچھڑوں کی باس سونگھ لی، اب لائیے کھلا دیجئے! یہ ایک حقیقتِ نفس الامری ہے کہ اگر بلیوں کی قوتِ شامہ سلب کر لی جائے تو وہ رزق کی دستیابی سے محروم ہو جائیں۔ بلی اپنی مونچھ کے بالوں

سے انگلیوں کا کام لیتی ہے اور ناک سے اسے کھلنے کی خواہش ہوتی ہے اور ناک ہی سے آنکھ اور زبان کا کام لیتی ہے اسے سونگھتے ہی ہر شے کی ماہیت اور لذت کا انداز ہو جاتا ہے۔

گائے اور بھینس کو بھی حس شامہ کا استعمال کرتے دیکھا گیا ہے۔ دودھ پلاتے وقت وہ اپنے بچھڑے کی بو سونگھ لیتی ہے۔ میں نے ایک گائے پر تجربہ کیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر چمڑے باندھے اور دوسرا بچھڑا اس کے قریب لایا گیا۔ بچھڑے نے بمشکل گائے کے تھن منہ میں لئے تھے کہ گائے نے اس کی بو سونگھی اور لتشتنگ مار مار کر اسے بھگا دیا۔

باغ حیوانات میں ہرن کی قوتِ شامہ کا تماشا دیکھا تھا جب گھاس اس کے پنجرے کی سلاخوں کے پاس لائی گئی تو اول اس نے خوب سونگھ لیا پھر گھاس کو منہ میں لیا۔

اپنے ایک دوست کے ہاں نیولے کی قوتِ شامہ کا تماشا دیکھنے میں آیا تھا۔ گوشت مچھلی خواہ کوئی شے اسے دی جاتی پہلے وہ سونگھ لیتا پھر کھاتا تھا۔ مشہور انگریزی شاعر گولڈسمتھ کی (Natural History) میں جنگلی بطخ کا حال سب نے پڑھا ہوگا۔ جنگلی بطخ کی قوتِ پرواز جیسی تیز ہے ویسی ہی قوت شامہ بھی تیز ہے۔ اس کا شکار بہت مشکل ہوتا ہے۔ شکاری کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ بہت دور سے اس کی بو پاکر اڑ جاتی ہے۔ اسی لئے شکاری پہلے سوکھی گھاس جلاتے ہیں جس کی باس شکاری کی باس کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور بطخ کو گھاس ہی گھاس کی بو آتی رہتی ہے حتیٰ کہ اسے بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔

بر سبیلِ تذکرہ آسٹریلیا کی مشکی بطخ کا بیان بے محل نہ ہوگا۔ اس کا رنگ بھدا ہوتا ہے۔ نر کے جسم سے ہیجان کے وقت مشک کی سی باس اڑتی ہے۔ اسی باس کو سونگھ کر مادہ نر کے پاس آجاتی ہے۔

گیدڑ اور چرخ شب بیدار جانور ہیں۔ خدا کی شان ہے کہ رات کی انتہائی تاریکی میں گلی سڑی لاشیں اکھاڑ کر یہ جانور کھا جاتے ہیں جو دن کی روشنی میں گدھ بھی نہیں تلاش کر سکتا۔

چھچھوندر کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے اور بصارت محض برائے نام۔ یہ اس کی شامہ ہی کا کرشمہ ہے کہ ہزاروں کیڑے مکوڑے محض باس پا کر رات کو شکار کر لیتی ہے اور لطف اندوز ہوتی ہے۔

سنگاپور کی کینیری چڑیا کو اگر منفاس النسیم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ زہریلا گیس کی مخبر ہے۔ آج کل ہر جگہ کوئلے کی کانوں میں اسے رکھا جاتا ہے۔ اگر کہیں زہریلی گیس نکلنے والی ہوتی ہے تو کینیری اپنے پنجرے میں بیقرار ہوتی ہے۔ پھڑپھڑاتی ہے، گویا خطرے کا الارم دیتی ہے! اسے بیقرار دیکھتے ہی لوگ کام چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہیں اور کان سے اوپر آجاتے ہیں۔

تحت البحر کشتیوں میں سفید چوہا رکھا جاتا ہے۔ سمندر کی گہرائیوں میں جہاں کاربن ڈائی اکسائڈ اور مونو آکسائڈ گیس بنتی ہے اس جگہ کے قریب پہنچتے ہی سفید چوہا ان گیسوں کی بو پا لیتا ہے اور بیقرار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کشتی بان سمجھ جاتے ہیں اور کشتی کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ اس طرح سفید چوہے کی قوتِ شامہ انسانی جانوں کو تلف ہونے سے بچا لیتی ہے:

کچھوے میں بھی قوتِ شامہ ہوتی ہے۔ چڑیا خانے میں گلباگوز جزیرے کا کچھوا دیکھنے میں آیا ہوگا۔ یہ اوپر منہ اٹھا کر چلتا ہے۔ ہوا سے بو لے کر اپنا رزق پاتا ہے۔ آبی کچھوا بھی سونگھ کر اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔ کچھوے کو یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ سونگھ کر گوبھی کے کھیت میں گوبھی کی مختلف اقسام کو شناخت کر لیتا ہے۔

گھونگا بھی اپنی قوتِ شامہ سے مدد لیتا ہے۔ ایم ماکوئن ٹینڈن صاحب نے اپنے بے شمار تجربات گھونگے پر کئے ہیں اور اپنی کتاب میں حوالۂ قلم کئے ہیں۔

گھونگے کی ہاتھی کی طرح نازک سونڈ ہوتی ہے، اس پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیں۔ ان آنکھوں سے کھانا نہیں دکھائی دیتا۔ اور دھندلی دھندلی روشنی نظر آتی ہے۔ ایک گلاس کے نیچے کچھ جڑیں، پتیاں رکھی گئیں اور کچھ فاصلے پر گھونگا تھا مگر وہ انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد جب گلاس ہٹایا گیا تو اسے باس پہنچ گئی اور وہ فی الفور ان جڑ پتیوں کے قریب باس سونگھ کر پہنچ گیا اسی طرح کیکڑے کی حس شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔

Sea - animouse نامی ایک ننھا سا آبی جانور ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف زنبور کی سی سوئیاں ہوتی ہیں۔ جس طرح ہمارے ملک میں رنگین مچھلیاں فوارے اور حوض کی زینت سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح اہلِ یورپ اپنے حوض کی اسے زینت تصور کرتے ہیں۔ اسے جہاں گوشت کی باس آئی اس نے چو رخہ رنگین سوئیاں پھیلائیں جو ورقِ گل کی طرح بن جاتی ہیں۔

حشرات الارض میں شامہ کا وجود ہے۔ فیلڈ، ہیوبر، لارڈ آوربری جیسے مستند علمائے حشریات نے اسے پایۂ ثبوت کو پہنچایا ہے چیونٹی، زنبور، مگس اور تتلی وغیرہ کے سر میں جو دو ڈنک لگے رہتے ہیں انہی کی وساطت سے یہ کیڑے سونگھتے ہیں۔ یہ ڈنک یا سونڈ ان کی ناک کی قائم مقام ہے۔

خوردبین کی مدد سے دیکھنے سے پایا گیا ہے کہ چیونٹی کی سونڈ میں کتنے ہی جوڑ ہوتے ہیں اور ہر جوڑ اپنے افعال میں دوسرے جوڑوں سے علیحدہ خصوصیات کا حامل ہے۔

فیلڈ نے تجربے سے انکشاف کیا ہے کہ چیونٹی اپنی سونڈ کے آٹھویں اور نویں جوڑ سے اپنے بچوں کی اور انڈوں کی بو سونگھ لیتی ہے اور ان کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ چلتے وقت اپنے جسم سے ایک بو چھوڑ جاتی ہے جو ایک طرح نشانِ معاودت ثابت ہوتی ہے۔ واپس ہوتے وقت وہ اپنی سونڈ کے دسویں حصے سے اس بو کو محسوس کرتی ہے اور ٹھیک مقام پر واپس آجاتی ہے۔ سونڈ کے گیارھویں حصے کی قوت شامہ سے وہ دوسری چیونٹیوں کو پہچانتی ہے۔

لارڈ آوربری نے ثابت کیا ہے کہ چیونٹیاں باصرہ کی بہ نسبت شامہ سے زیادہ مدد لیتی ہیں۔ ان کی آنکھیں برائے نام ہوتی ہیں۔ آنکھوں کا نقشہ ضرور ہوتا ہے لیکن کوئی زیادہ کام نہیں لیا جاتا۔ وہ اپنا سب کام سونڈ کی سوئیوں سے انجام دیتی ہیں۔ اگر سوئیاں کاٹ دی جائیں تو ان کا سب کام بند ہو جائے۔

فان فرش جرمن فاضل حشریات نے تجربہ کیا ہے کہ شہد کی مکھی کی سونڈ کے سات حصّے کاٹ دئے جائیں تو بھی اس کی شامہ باقی رہتی ہے، لیکن آٹھواں حصہ کاٹنے پر شامہ باقی نہیں رہتی۔

ست پڑا کے کوہستانی علاقوں میں اکثر شکار کی غرض سے مجھے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ان کے جنگل میں ایک مرتبہ ایک درخت کے نیچے سے میں گزرا۔ میں نے اپنی ٹوپی اتار لی تھی۔ اسی درخت پر شہد کا چھتا لگا تھا میرے درخت کے نیچے پہنچتے ہی مکھیوں نے حملہ کر دیا۔ بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی۔ میرے ہمراہی دو گونڈ تھے وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ جب ہم دور پہنچے تو وہ گونڈ ہانپتے ہانپتے کہنے لگے کہ صاحب آپ نے خوشبودار تیل لگایا ہے میں نے اثبات میں جواب دیا تب انہوں نے بیان کیا کہ مکھیاں خوشبودار تیل لگانے والوں پر ضرور حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہ حادثہ مجھے عجیب و غریب معلوم ہوا۔ اس کے بعد کئی دن تک میں نے گائے، بیل کی پشت پر وہی خوشبودار تیل لگایا اور انہیں درخت کے نزدیک چھوڑا تو بھی مکھیوں نے چوپایوں پر حملہ کیا۔

تتلی دور سے پھولوں کی باس سے کر باغ میں آجاتی ہے اور پھر باصرہ سے امداد لے کر اپنی پسند کے پھولوں سے کھیلتی ہے۔ مادہ تتلی کے جسم میں ایک خاص قسم کی بو ہوتی ہے جسے ہم محسوس نہیں کر سکتے۔ لیکن نر دور دور سے اسے سونگھ کر مادہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسٹینڈفس، ینبر، لیوبک، رالی وغیرہ فضلا نے اس قسم کی بے شمار معلومات اپنے تجربات کی بنا پر فراہم کی ہیں جو علمی دنیا کے لئے نہایت دلچسپ اور سودمند ہیں۔

رالی نے ایک دفعہ ریشم کا مادہ کیڑا لیا۔ اسے ایک میل دور رکھا۔ پھر ایک نر کیڑے کو خاص نشان لگا کر چھوڑ دیا۔ دوسرے دن نر کیڑا مادہ کے قریب پہنچ گیا تھا۔

سٹینڈفس نے ایک مادہ پروانے کو اپنے دریچے میں باندھ کر رکھا۔ ساڑھے تین گھنٹے میں ۱۲۹ نر اس کے پاس آپہنچے تھے۔

بیل نے چینی ریشم کے ایک کیڑے کو جالی دار کپڑے میں اٹکائے رکھا اور ریلوے کے دوسرے اسٹیشن سے خاص نشان لگا کر کثیر تعداد میں نر کیڑے چھوڑے۔ ان میں سے چالیس نر محض مادہ کی بو پا کر اتنی مسافت طے کر کے وہاں پہنچ گئے۔

کھٹمل کی شامہ کا تجربہ سب کو ہُوا ہوگا۔ اسی طرح کم و بیش تمام کیڑوں مکوڑوں میں قوت شامہ ہوتی ہے

حیوانات کی قوتِ شامہ سے ہماری شامہ کو کچھ نسبت نہیں۔ ہم میں قوت شامہ تھی، اُس وقت جب عمرانیات کا سبق ہم نے نہیں پڑھا تھا۔ جب ہم وحشی جانوروں کی طرح غاروں اور پہاڑوں کی کھوہوں میں رہتے تھے۔ اس وقت آدمی کو شامہ سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ امتدادِ زمانہ نے یہ حس ہم سے چھین لی۔ اب بھی افریقہ کے غیر متمدن اور ہندوستان کے وحشی انسانوں کی قوتِ شامہ تیز تر ہے۔

افریقی غیر متمدن باشندے اگر راستہ بھول جاتے ہیں تو سونگھ سونگھ کر تلاش کر لیتے ہیں، اور ہندوستان کی بعض وحشی اقوام کے افراد سونگھ کر شکاری کا پتا لگا لیتے ہیں۔

بخلاف ازیں مہذب دنیا نے صرف خوشبوؤں کے لئے اپنے مشام کو وقف کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہ خطرہ بھی لاحق ہو رہا ہے کہ آئندہ اتنی حسِ شامہ بھی باقی رہے گی یا نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ولایت کے ایک اخبار میں میں نے یہ خبر دلچسپی کے ساتھ پڑھی تھی کہ ایک امریکن خاتون کو جن کی حسِ شامہ غایت درجہ تیز ہے کسی عطر ساز کمپنی نے اعلیٰ منصب عطا کیا ہے اور خاتون موصوفہ نے کئی ہزار ڈالر کے لئے اپنی قوتِ شامہ کا بیمہ کرایا ہے۔

حسن عزیز جاوید

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص پیغمبر اسلام کی خدمت میں آیا کہ میں سخت بھوکا ہوں۔ آپ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا صرف پانی۔ آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "کوئی ہے جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے"۔ ابوطلحہ نے عرض کی "میں حاضر ہوں" غرض وہ اپنے گھر گئے لیکن وہاں بھی برکت تھی بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے۔ انہوں نے بیوی سے کہا "چراغ بجھا دو اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو"۔ تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں۔ اسی واقعہ کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(اور گو ان کو خود تنگی ہوتا ہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں) (منقول)

جو لگا ہے کہ نئے تعلقات پیدا نہیں کرتا رہتا وہ جلد تن تنہا رہ جاتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ ہمیشہ اپنی دوستیوں کی مرمت کرتا رہے۔

سچا دوست ملنا سخت دشوار ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب تک کوئی شخص پورا دیانت دار نہ ہو وہ سچا دوست نہیں بن سکتا۔

گلچیں

وادیٔ افلاس و محبّت

یہ کس پُرشور وادی کی فضائے فتنہ ساماں ہے
کہ جس کا ذرہ ذرہ عالمِ وحشت میں لرزاں ہے

بگولے اڑ رہے ہیں مشتعل ہو کر فضاؤں میں
ہلاکت مرتعش ہے مضطرب خونیں ہواؤں میں

وہ ظلمت ہے کہ ہیبت کا فرشتہ کانپ جاتا ہے
وہ تاریکی ہے شیطانوں کا دل بھی خوف کھاتا ہے

اندھیری رات اور طوفانِ ابر و باد کا منظر
یہ ہیبت زا فضا یہ فطرتِ آزاد کا منظر

فلک پر آتشیں سانپوں کے لہرانے کی حد ہو گی
کہ مجلس بجلیوں کی آج ہو گی منعقد کوئی

لرز کر جگمگا اٹھی ہے جنگل کی فضا ساری
چمک کر تھرتھرا اٹھی ہے جنگل کی فضا ساری

ہوا کی سرسراہٹ ہے کہ جنگل سانس لیتا ہے
فضا کی گنگناہٹ ہے کہ جنگل سانس لیتا ہے

یہ پُراسرار وادی کوئی طوفانوں کی بستی ہے
یہ آفت گاہ دہشت خیز ہیجانوں کی بستی ہے

یہ سیلابِ فنا کا ارتعاشِ بیکراں، توبہ
یہ افلاس و محبّت کا تلاطم، الاماں، توبہ

یہ ہیبت ناک تاریکی یہ دہشت، یہ پریشانی
اور اس آفت کدے میں امتحانِ تابِ انسانی؛

معاذ اللہ خدا بھی آدمی بن کر اگر آئے
فنا ہو جائے افلاس و محبت کے تھپیڑوں سے

عدم

کام چور!

مئی کے دن تھے۔ صبح تین بجے کا عمل تھا۔ گھر کے سب لوگ صحن میں سو رہے تھے۔ رات بھر مارے حبس کے آنکھ نہیں لگی تھی۔ اس وقت کہیں سے بھولی بھٹکی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس ہوا میں اگر خنکی نہ تھی تو کم از کم حدت بھی نہ تھی۔ لوگ جو کروٹیں لیتے لیتے تھک گئے تھے اب پاؤں پسار کے سو گئے۔ گزشتہ دن کی تکان جو اس قیامت کی رات میں دور نہ ہوئی تھی، اب تازہ ہوا جسم کے بند بند سے اڑائے لئے جا رہی تھی۔ دماغوں پر ایک پرکیف سکون طاری ہو رہا تھا۔ تمام صحن میٹھی نیند میں تھا کہ اتنے میں پہلے آہستہ پھر ذرا زور سے اور پھر بلند آواز سے ننھے نے رونا شروع کیا۔ بیوی گہری نیند میں سو رہی تھیں ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ننھے کی ٹانگیں اور پھر بازو رونے کے ساتھ ہی ہلنے شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حرکت میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ سرکتا سرکتا ماں کے پیٹ سے نزدیک تر ہو گیا۔ اور اسکی ٹانگیں ماں کے جسم پر پڑنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ننھے نے پوری آواز سے چیخنا شروع کر دیا۔ آخر مرغوب جاگ اٹھا۔ پہلے دو ایک ساعت تو اسے اپنی گھبراہٹ کی وجہ معلوم نہ ہوئی پھر اسے ننھے کے رونے نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کہا "آماں! اماں!!" اور پھر اور زور سے "اماں!" بارے بیوی کو ہوش آیا۔ ہڑبڑا کے جاگیں "کیوں؟ کیا ہے؟"

"ننھا مدت سے رو رہا ہے۔ سونے نہیں دیتا۔"

بیوی نے پہلے تو ننھے کو نیم خوابی ہی کی حالت میں تھپکانا چاہا مگر ننھا چپ نہ ہوا۔ پھر ایک کہنی کے سہارے ذرا اوپر ہو کے دوسرے ہاتھ سے ننھے کو اٹھایا۔ دیکھا تو کپڑے خراب کئے ہوئے تھا۔ انہوں نے آواز دی "کریمن! اری او کریمن!" پھر "کریمن! کریمن! کریمن!" پھر "کم بخت مردوں سے شرطیں باندھ کے سوتی ہے! او کریمن! کریمن" مگر کریمن سب سے دور اپنی چارپائی پر چت لیٹی آرام سے سو رہی تھی۔ آخر بیوی نے کہا۔ اس کم بخت پر خدا کی مار لاکھ سر پٹکو جاگتی ہی نہیں۔ خدا جانے اسے سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے۔ او کریمن، اے کریمن۔ مگر کریمن کہاں!

تھک کے بیوی بالکل اٹھ بیٹھی، دونوں ہاتھوں سے ننھے کو اٹھایا۔ سرہانے اسٹول پر لیمپ مدھم سا جل رہا تھا ہاتھ بڑھا کے بتی کو اونچا کیا۔ دیکھا تو ننھے کا بچھونا سب لت پت تھا۔ اپنے جاگنے پر، اس بے وقت کی تکلیف پر اور باقی سب کے سوئے رہنے پر، بیوی کو بہت غصہ آیا۔ آواز دی۔ "مرغوب او مرغوب!" "وہ بیچارا ابھی کچھ نیند میں

تھا۔ پھر چونک پڑا اور ذرا ترشی سے بولا کیا ہے؟"

"ذرا اٹھ کے اس نامراد کو جگا تو دو۔ مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے"۔

مرغوب طوعاً و کرہاً اٹھا۔ جا کے کریمن کے کندھے کو ہلایا۔ جب اس سے کچھ اثر نہ ہوا تو ذرا زور زور سے اسے جھنجھوڑا اور آوازیں بھی دیں۔ خیر کریمن کی آنکھ کھلی۔ جب چارپائی سے پاؤں نیچے رکھا تو بیوی نے غصے سے کہا ادھر آ مردار! میں گھنٹے بھر سے آوازیں دے رہی ہوں تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پانی لا میں ننھے کو دھوؤں"۔

کریمن آنکھیں ملتی ہوئی گھڑونچی سے جو صحن میں پڑی تھی لوٹا بھر لائی اور ننھے کو دھلوایا۔ پھر بیوی کے کہنے پر غلیظ پوتڑے بستر سے اٹھائے اور نئے بچھائے۔ باورچی خانے میں جا کے ہاتھ دھوئے اور اپنے بستر پر آ کے لیٹ رہی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ صبح کے چار بج رہے ہونگے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ صحن میں خاموشی چھا رہی تھی سانس لینے کی آوازوں پر بھی سکوت نے غلبہ پالیا تھا کہ بیوی کے بائیں طرف کی ایک چارپائی پر ایک تین برس کا بچہ اٹھ بیٹھا اور اماں اماں کہہ کر چلانے لگا۔ جب دھیمی آواز سے کچھ نہ بنا تو اونچی آواز سے پکارنا شروع کیا۔ بیوی کی آنکھ کوئی بیس منٹ ہوئے لگی تھی کہ اب اور حملہ شروع ہوا۔ خیر اب کے جلدی جاگ اٹھیں۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا "پانی" اس پر بیوی نے آواز دی "کریمن، او کریمن! او کریمن!

"جی"

"اری تو ایک آواز سے نہیں اٹھ سکتی۔ پہروں کوئی جگاتا رہے پھر کہیں اٹھتی ہے۔ بشیر کو پانی دے وہ پیاس سے ہلکان ہو رہا ہے"۔ کریمن نے اٹھ کے بشیر کو پانی پلایا اور پھر گلاس کو گھڑونچی پر رکھ جا کے سو رہی۔

اتنے میں پانچ بھی بج گئے۔ ہوا بدستور چل رہی تھی۔ اب تو اس کے جھونکوں میں کچھ خنکی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے سونے والوں میں سے بعض نے پائنتی سے چادریں اٹھا کر اوڑھ لی تھیں اور بے فکری کی نیند کے مزے لے رہے تھے کہ صحن کے ایک کونے سے کھانسنے کی آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ پہلے تو آہستہ جیسے کوئی گلا صاف کرتا ہو، پھر رک رک کے، پھر پوری آواز سے۔ مگر آوازیں توانائی نہ تھی۔ کھانسی کے ایک حملہ کے بعد حلق سے ایک آدھ تکلیف کا سانس بھی نکل جاتا تھا۔ یہ بیوی کی ساس تھیں۔ - جوتی پاؤں سے ٹٹول کر پہنی۔ اور چارپائی کی پٹی پر دونوں ہاتھوں کو دبا کے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھیں اس وقت آسمان سے تاریکی غائب ہو چکی تھی۔ بیوی کے سرہانے لیمپ بدستور مدھم لو سے جل رہا تھا۔ اسے بجھایا۔ بجھا کے اسے وہاں سے اٹھا کے صحن کی اس الماری میں جہاں لیمپ رکھے جاتے تھے رکھ دیا۔ پھر ادھر ادھر اپنے لوٹے کے لئے نظر دوڑائی۔ کیوں کہ ان کا لوٹا مخصوص تھا۔ کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا مگر وہ لوٹا نظر نہ پڑا۔ باورچی خانے میں بھی دیکھا۔ وہاں بھی نہ دکھائی دیا۔ باہر گھڑوں کے پاس بھی نہ تھا۔ حیران ہوئیں کہ لوٹا کہاں گیا پہلے تو کسی اور لوٹے کی فکر میں نظر اٹھائی مگر پھر جی نہ چاہا۔

اس لئے صحن کے دوسری طرف کریمن کی چارپائی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

اسے جگایا۔ وہ اٹھی، اٹھ کے بڑی بی بی کو سلام کیا اور پھر ان کے استفسار کے جواب میں لوٹا ڈھونڈھنے چلی صحن میں اس نے دیکھا، کہیں نہ تھا۔ بڑی بی بی نے پوچھا "آخر تم رات برتن دھو کے سوئی تھیں یا نہیں؟"

"جی"

"تو میرا لوٹا بھی دھویا ہوگا"

"جی ہاں آپ کا لوٹا تو میں نے بہت احتیاط سے صاف کیا تھا۔ دیکھوں شاید باورچی خانے میں رکھ دیا ہوگا۔ باورچی خانے گئی اور وہاں سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کے بعد بڑی بی بی کا لوٹا نکال لائی۔ صحن اب کافی روشن ہوگیا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ ذرا تھوڑا سا اور سو لیا جائے پھر یاد آیا کہ رات برتن بہت سے تھے اس لئے ان کو دھوتے دھوتے دیر ہوگئی تھی اور گھڑے نہیں بھر کے سوئی تھی۔ نیند تو بہت آرہی تھی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں مگر بیوی کی آنکھیں یاد آگئیں۔ اس لئے اپنا بستر لپیٹ، چارپائی اٹھائی اور دیوار سے لگا دی۔ بستر کو فالتو سامان والی کوٹھڑی میں رکھ آئی۔

صحن کے ایک کونے میں ہاتھ سے چلا کر پانی نکالنے کا نل لگا تھا۔ اس کے پاس گھڑے اٹھا لائی اور نل سے ایک، دو، تین حتیٰ کہ چار پانچ گھڑوں کا پانی نکالا۔ اٹھا اٹھا کے انہیں اپنی جگہ پر رکھا پھر صحن میں آئی اور بیوی کی پائنتی سے ننھے کے مستعمل پوتڑے لئے اور انہیں ایک طرف ایک تسلے میں ڈال آئی۔ پھر اوپر جا کر وہ کپڑے جو رات کو دھلوا کے سکھانے کے لئے رسیوں پر ڈال رکھے تھے، اٹھا لائی۔ انہیں تہ کر کے بیوی کی پائنتی رکھ دیا۔ پھر ہاتھ منہ دھویا۔ گیلے گیلے ہاتھ بالوں پر پھیر کے جو جو بال سوتے میں بکھر گئے تھے انہیں جما دیا۔ مگر چونکہ رات گرمی کی وجہ سے بہت بے آرامی سے گزری تھی اور کروٹوں اور سر کے ہلنے جلنے سے بال کچھ معمول سے زیادہ بکھر گئے تھے، اس لئے وہ اپنی اسی سامان والی کوٹھڑی میں جہاں اس کا صندوق اور اس کی ایک آدھ دوسری چیز رکھی تھی گئی اور ایک میلی سی دو تین ٹوٹے ہوئے دندانوں والی کنگھی نکال لائی۔ ابھی وہیں کھڑی کھڑی چوٹی کھول رہی تھی کہ صحن سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں "او کریمن اری او کریمن! کہاں غارت ہوگئی؟" کنگھی کو وہیں چھوڑ چوٹی کو باندھتی ہوئی "جی آئی" کہہ کر باہر نکل آئی۔ دیکھا تو بڑی صاحبزادی رقیہ اور میاں اصغر جاگے ہوئے ہیں اور وہیں سے چلا رہے ہیں "او کریمن، او کریمن" "اری کہاں مر گئی؟" کریمن نے کہا جی میں تو یہیں تھی۔ کمرے میں بستر رکھنے گئی تھی"۔ رقیہ بولیں "اری جھوٹ کیوں بکتی ہے، اپنا ٹن کہیں کی تو تو بال بناتی آئی ہے"

"نہیں تو بی بی جی میں نے تو بالوں سے کنگھی تک نہیں چھوئی"۔

توبہ کری توبہ! تو تو چٹیا سے لپٹی چلی آرہی تھی، جھوٹی کہیں کی، پانی لا منہ دھوئیں، تو مجھے بھول

جاتی ہے، مجھے سکول جانا ہے، اب چھ بجے کھلتا ہے، چھ بجے!"

دوسری طرف سے میاں اصغر بولے "کریمن میرے کپڑے نکال لا مجھے بدلنے نہیں؟"

رقیہ:- خود اٹھ کے کیوں نہیں پہن لیتا۔ سستی کا مارا ہوا۔

اصغر:- تو آپا تم ہی کیوں نہیں پانی اٹھ کے لے لیتیں۔ اور ابھی تو کسی نے آگ تک نہیں جلائی، میں آج کھا کے کیا جاؤں گا۔ اماں، اے اماں! اٹھو بھی نا، اب سکول کا وقت ہوتا جا رہا ہے، یہاں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا"۔

بیوی بھی جاگ اٹھیں۔ کہنے لگیں "ابھی تو بہت سویرا ہے، کیوں اتنا شور مچایا ہے؟"

"شور کس نے مچایا ہے؛ میں تو آپ کو جگا رہا تھا یہ آپا ہی صبح سے چلا رہی ہیں"

"بکومت اصغر! اٹھتے ہی تو تم نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے کیا کیا؟"

"تو اماں کریمن سے کہو نا کچھ کرے، میں کھا کے کیا جاؤں گا؟"

"او کریمن!"

"جی! بیوی! ابھی آئی۔ میں بی بی جی کے لئے صابن تولیہ لا رہی ہوں"۔

رقیہ نے کہا "اماں یہ کریمن ایک کام میں دس گھنٹے لگاتی ہے۔ آپ اسے کچھ کہتیں بھی نہیں"۔

بیوی نے رقیہ کو تو کچھ جواب نہ دیا کریمن سے کہا "مرغوب کو جگا دے۔

رقیہ منہ دھو رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ رات کی گرمی کی وجہ سے کپڑے بدن سے لگ رہے ہیں رات پسینہ بہت آتا رہا ہے اس لئے منہ ہاتھ دھونا چھوڑ کر کریمن کو حکم دیا کہ غسل خانہ میں صابن اور تولیہ رکھ آئے۔ وہ اُدھر گئی، آپ اندر سے اپنے اسکول کے کپڑے نکال غسل کرنے چلی گئی۔ مگر اصغر اور مرغوب کو کون نہلائے، انہوں نے منہ ہی دھونے پر اکتفا کیا اور اندر جا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ کریمن نے رقیہ سے فراغت پا کر جلدی جلدی آگ جلائی اور دو چار روٹیوں کا آٹا گوندھ لیا۔ اتنے میں اصغر اور مرغوب ناشتہ کے لئے سر ہو گئے۔ انہیں معمول کے مطابق چھوٹے چھوٹے نمکین پراٹھے پکا دئے اور ساتھ دہی دے دیا۔

بی بی رقیہ کے لئے اب لسی بنانی تھی، کیونکہ وہ پراٹھے کے ساتھ ہمیشہ لسی پیا کرتی تھی مگر کریمن تو روٹی پکا رہی تھی، لسی کون بنائے؛ رقیہ نے شور مچانا شروع کیا۔ میری لسی کہاں ہے؟ میری لسی نہیں بنائی؟ کریمن نے پہلے کیوں نہیں بنائی؟ . . . . . خیر یہ گزری کہ اب تک رقیہ کی دادی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اس لئے بیوی نے ان سے کہا "اماں رقیہ کی لسی ذرا بنا دو اس نے شور مچا رکھا ہے۔ دادی اماں نے کریمن سے پوچھا بلونی کہاں ہے۔ اس نے کہا باورچی خانے میں وہاں بڑی بی بی کو نہ ملی تو۔ پھر شور ہوا "یہ کریمن کبھی چیز جگہ پر رکھتی بھی

ہے یا نہیں اس پر خدا کی مار، ابھی کل تو یہاں دیکھی تھی، یہاں پڑی تھی یہاں۔۔۔۔۔ کریمن نے کہا باورچی خانے میں برتنوں کی الماری کے اوپر کے خانے میں رکھی تھی کسی دیگچی کے پیچھے ہو گئی ہو گی۔ بارے بلونی ملی۔ لسی تیار ہوئی رقیہ نے ناشتہ کیا۔ ادھر اصغر اور مرغوب نے بھی اپنا اپنا پراٹھا ختم کر لیا تھا۔ اتنے میں رقیہ کے سکول کی ملازمہ آ گئی وہ اس کے ساتھ سکول چلی گئی ادھر لڑکے بھی اپنے سکول کو روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد بیوی جی اٹھیں۔ اُٹھ کے پہلے شب خوابی کا میلا پاجامہ تبدیل کیا۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر اپنی ساس کے بالوں میں کنگھی کرائی۔ اتنے میں کریمن چولھے کے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس سے کہا گیا کہ بستر اٹھا دے۔ اس نے سب بستر اندر رکھے اور چارپائیاں اٹھا کر ایک طرف رکھیں۔ پھر دالان کے آگے سے اور چولھے کے قریب قریب سے جھاڑو دیا۔ تھوڑی دیر میں مہترانی آ گئی اس نے کہا بی بی پہلے پوتڑے دھلوا لیجئے۔ اس لئے کریمن سے پھر کہا گیا کہ پانی بھر بھر کے مہترانی سے کپڑے دھلوائے۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ سے زائد وقت اس کام میں صرف ہو گیا۔ بیوی کا اور اپنا ناشتہ بڑی بی بی نے تیار کر لیا تھا کیونکہ بیوی تو فقط تھوڑا بہت گوندوں کا حلوا جو بنا کر رکھا ہوا تھا، کھایا کرتی تھیں، باقی رہیں بڑی بی بی انہوں نے دہی سے ایک آدھ چپاتی کھا لی۔

کریمن نے اس اثنا میں مہترانی کا گھڑا بھر دیا جس سے وہ نالیاں وغیرہ صاف کیا کرتی تھی۔ بعد میں اس نے ہاتھ وغیرہ دھو کے، نوکر کو آواز دی۔ اس سے گوشت اور میتھی پالک کا ساگ لانے کو کہا۔ خود گھر کا آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ آج اسے کچھ فرصت سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بڑے میاں دورے پر جا چکے تھے اور آج ان کے ناشتہ کی تیاری کا کام نہیں تھا اتنے میں نوکر سودا سلف لے آیا۔ اس نے آواز دی کہ سودا لے لیجئے۔ کریمن آٹا گوندھ رہی تھی اس لئے نہ اٹھی بیوی نے نوکر کی دوسری آواز پر خفا ہو کر کہا "کیوں ری اٹھتی کیوں نہیں اور کون تیرا باوا اٹھ کے جائے۔ سنتی نہیں وہ دیر سے کھڑا آوازیں دے رہا ہے" کریمن اٹھنے کو ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا "میں لے آتی ہوں تو گوندھتی جا۔ جب آٹا گوندھ لیا تو مصالحہ پیسا، آگ جلائی اور گوشت چڑھا دیا۔ اب میتھی چن رہی تھی کہ آواز آئی "کریمن بھاگ کے آیئو، جلدی آ جلدی، کریمن چلی جا رہی تھیں کہ پھر بیوی جی پکاریں" اری آتی ہے کہ نہیں ادھر ننھے نے سارا بستر خراب کر دیا ہے۔ بارے کریمن نے جا کے ننھے کو دھلوایا۔ نچلے کپڑے بدلوائے اور پھر سبزی کاٹنے لگ گئی۔

کریمن کو اب شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ کیونکہ صحت مند جسیم ہونے کے باعث صبح ہی سے پیٹ خالی خالی سا لگتا تھا۔ آج رات کی باسی روٹی بھی کوئی نہ بچی تھی اور صبح کے پراٹھوں کے بعد جو دو ایک چپاتیاں پکائی تھیں وہ بڑی بی بی نے کھا لی تھیں۔ پھر بھی شاید ایک آدھ ٹکڑا بچا کھچا رہ گیا ہو اس لئے میتھی چھوڑ وہ باورچی خانے میں جانے کو تھی کہ بیوی جن کی آنکھیں دن بھر اور لوگوں کے کام میں گڑی رہتی تھیں" پکاریں اب کہاں

سیر کے لئے جارہی ہے۔ یہ مینتھی جلدی جلدی صاف کر۔ لڑکے آدھی چھٹی میں ابھی آجائیں گے"۔ کریمن نے کہا ابھی ذرا دیکھنے چلی تھی کوئی ٹکڑا بچا ہو، بھوک لگ رہی تھی۔ بولیں "تجھے تو ہر وقت بھوک ہی لگی رہتی ہے"۔

کریمن نے ساگ کاٹ کر دھویا اور دیگچی میں ڈال دیا۔ اب ذرا ایک لمحہ کی فرصت ہوئی تھی کہ بیوی نے کہا "کریمن یہ لڑکوں کے تکیوں کے غلاف بہت میلے ہوگئے ہیں، انہیں اتار کے لا اور ان کا ٹرنک بھی اٹھا لا میں تجھے دھلے ہوئے غلاف نکال دوں۔ چنانچہ غلاف بدلے گئے۔ بڑی بی بی نے پوچھا "دھوبن کپڑے نہیں لائی بہت عرصہ ہوگیا ہے، کیا ہوا اسے؟" بیوی نے کہا "اس کی لڑکی بیمار ہے شاید اس لئے دیر ہوگئی ہو۔ کریمن جا تو رحیمے کو آواز دے۔ اسے دھوبی کے ہاں بھیجیں اور وہاں اندر سے میلے کپڑے بھی اٹھا لا۔ کپڑوں والی کاپی بھی لا کپڑے لکھوں" چنانچہ کپڑے لکھے گئے۔ رحیمے سے جو کبھی کا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا کہا کہ دھوبن سے جا کے کہہ دے کہ آکے کپڑے لے جائے پندرہ دن ہوئے خبر ہی نہیں لی۔

کپڑے رکھ ابھی چولھے کے پاس بیٹھی ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا "کریمن ذرا میرے بالوں میں کنگھی کردے اندر سے اٹھا لا میری کنگھی۔ جانے سر میں کم بخت کھجلی کیوں ہوئی جارہی ہے۔ کریمن نے اٹھ کے بڑی بی بی کی کنگھی چوٹی کی۔ خیال آیا کہ اب تو ذرا فرصت ہے۔ اپنے بالوں میں بھی کنگھی کرلوں۔ اس لئے اپنی کوٹھڑی میں گئی اور وہاں بال بنا کے چوٹی باندھ رہی تھی کہ بی بی جی نے آواز دی "کریمن دیکھو سالن کو، کہیں جل نہ جائے" کریمن آکے پھر پکانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اب دس بج گئے تھے اصغر اور مرغوب آگئے۔ انہیں جلدی سے روٹی پکا کر دی۔ پھر باقی آٹے کی روٹیاں پکائیں۔ آگ بجھائی، پرات دھوئی، پھر بیوی اور بڑی بی بی کو کھانا دیا۔ رقیہ کے لئے الگ سالن ڈال کے رکھا اور باہر رحیمے کو روٹی دی۔ بعد اس کے آپ روٹی کھائی۔ اب سورج سر پر آچکا تھا۔ سارا صحن تپنا شروع ہوگیا تھا۔ اس لئے سب برتن اٹھا وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

بڑی بی بی نے اور بیوی نے کھانا کھا کر کریمن سے برتن اٹھانے کو کہا۔ ان کے برتن باہر کے برتن اور باقی سب برتن اکٹھے کئے۔ انہیں مانجا مگر برتنوں کو کریمن آہستہ آہستہ دھو رہی تھی اس ڈر سے کہ اگر جلدی جلدی دھو کے فارغ ہوگئی تو دیکھتے ہی بیوی کوئی نہ کوئی کام دے دیں گی لیکن ابھی دھو ہی رہی تھی کہ ننھے میاں کی رونے کی آواز آئی۔ اس نے برتنوں کو ادھر اُدھر ذرا زور سے فرش پر رکھنا شروع کیا کہ آواز سن کر بیوی سمجھ جائیں کہ برتن مانج رہی ہے مگر بیوی کہاں ننھے کو بہلانے کے لئے اٹھا کر ادھر ادھر پھریں وہیں سے آواز دی "او کریمن ادھر آئیو" کریمن ہاتھ دھو کے گئی تو حکم ہوا کہ ننھے کو ذرا لے کے پھر، روتا ہے اور پنگوڑے میں بھی چپ نہیں ہوتا۔ کریمن نے پوچھا "بیوی دودھ کے لئے تو نہیں روتا؟" بیوی بولیں "توبہ ہے نگوڑی مت سو دیا کر"۔ دودھ میں نے اسے دس دفعہ پلایا ہے، اب وہ دودھ نہیں پیتا۔ معلوم نہیں اسے کیا خلل ہے؟ اسے لے کے ٹہل یہیں دالان میں"

یہ تھا دوپہر بھر کا کام۔ بی بی رقیہ جب اسکول سے آئیں تو انہیں کھانا دیا۔ کچھ دیر پنکھا جھلتی رہی۔ مگر بیوی نے پھر بلا بھیجا۔ کریمن ادھر گئی ہی تھی کہ رقیہ نے پھر چیخنا شروع کیا: "او کریمن کریمن" آہ بیوی کے دالان میں، انہیں پنکھا کر رہی تھی کیونکہ دوپہر کی گرمی میں وہ تو سو گئی تھیں مگر کریمن کو حکم دے دیا تھا کہ پنکھا جھلتی رہ۔ صبح پانچ بجے سے اٹھی ہوئی تھی۔ ابھی تک سو دفعہ ہی اندر باہر نکلی ہوگی، بدن چور چور ہو رہا تھا۔ پنکھا جھلتے جھلتے ذرا انگھلا گئی تھی کہ رقیہ کی آواز نے چونکا دیا۔ اب جواب دیتی ہے تو خطرہ ہے کہ بیوی جاگ نہ اٹھیں اور نہیں دیتی تو بی بی رقیہ سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ ناچار اٹھی اور رقیہ کے کمرے میں گئی۔ وہاں یہ کام تھا کہ ان کے کمرے کے دروازے بند کر کے باہر سے چکیں چھوڑ دی جائیں اور کہیں سے انہیں پنکھا ڈھونڈ کے لا دیا جائے کیونکہ ان کے پنکھے کو تو ہر وقت چور پڑے رہتے ہیں۔

پنکھا تلاش کرتی پھرتی تھی کہ بیوی کو مکھیوں نے تنگ کیا انہوں نے منھ کے اوپر تو ململ کا ایک دوپٹہ ڈال دیا تھا لیکن چونکہ کریمن انہیں پنکھا جھل رہی تھی اس لئے خود ویسے ہی پڑی تھیں۔ اب مکھیاں جو منہ ناک پر بیٹھنے لگیں تو وہ جاگ اٹھیں۔ کریمن کو کٹنی مالزادی سب کچھ بنا دیا خوب خفا ہوئیں۔ خیر گزری کہ ننھا سو رہا تھا آواز بہت اونچی نہیں نکالتی تھیں ورنہ شامت ہی آجاتی۔ کریمن آئی اور ساری دوپہر بیوی کے سرہانے پیڑھی پر بیٹھی اونگھتی ہوئی پنکھا جھلتی رہی۔ بہت دیر ایک جگہ بیٹھے رہنے سے پاؤں بھی سو گئے مگر بیٹھی اونگھتی رہی۔

سہ پہر کے وقت پھر نقل وغیرہ کا سامان کرنا تھا۔ کسی کے لئے لسی بنائی۔ کسی کو خربوزے منگوا کے دئے اور بیوی کو ٹھنڈائی بنا کے دی۔ پھر شام کا سودا منگوایا۔ مصالحہ پیسا۔ ہنڈیا چولھے پر رکھی، سالن پکایا روٹی پکائی۔ باقی دن اسی طرح گزر گیا۔ اس میں بی بی رقیہ کے کمرے میں جھاڑو دینا بھی شامل تھا کیونکہ ان کی چاندنی پر غلطی سے میلا پاؤں رکھا گیا تھا۔ رقیہ نے اس کو اندھی، ملنگنی، گدھی اور جو جو کچھ ان کی زبان پر آیا کہا۔ اور یہ بھی کہا کہ ہمارے سر پر یہ عذاب معلوم نہیں کیوں سوار ہے۔ ایک آواز تو کبھی سنتی نہیں، دس آوازیں دو تو کچھ سنتی ہے اور پھر کام ایسا بد دلی سے کرتی ہے کہ نہ ہونے سے بدتر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اماں نے اسے کیوں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال ہر شام کریمن نے صحن میں چارپائیاں بچھا دیں۔ ان پر سب کے بچھونے کئے پھر سب کو کھانا کھلا کے، برتن اکٹھے کر کے انہیں صاف کیا۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ کریمن نے ابھی ابھی برتنوں سے فراغت حاصل کی تھی۔ اب گھر اصفہ کر رہی تھی۔ ٹانگیں ایسی بوجھل محسوس ہو رہی تھیں جیسے ان میں سیسہ بھرا ہوا ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں لہذا اس نے سوچا کہ پانی صبح اٹھ کے بھروں گی اب تو نل نہیں چلا جائے گا۔ اور پھر اس کے چلانے سے شور بھی ہوگا۔ اور سوچا کہ گھڑونچی کے گھڑے تو ابھی خالی نہ ہوئے ہوں گے کیونکہ سہ پہر کو دیکھے تھے آدھے آدھے بھرے ہوئے تھے۔ اس لئے اپنی چارپائی بچھانے چلی۔ آج پھر ہوا بند تھی مگر کل جتنا حبس نہ تھا۔ چارپائی تو بچھالی۔ اندر سے بستر لانا دوبھر

ہو گیا۔ بہر حال بے آئی اور پھلنے کے ساتھ جو پڑی تو ایک ہی منٹ میں سو گئی۔

ابھی رقیہ اور اصغر جاگ رہے تھے۔ اپنے اپنے اسکول کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں اصغر کو پانی کی ضرورت ہوئی۔ وہ اُٹھ کے لوٹا بھرنے گیا تو دیکھا کہ گھڑے میں پانی نہیں ہے۔ بس اس نے چلانا شروع کیا "گھڑوں میں کبھی پانی ہوتا ہی نہیں۔ معلوم نہیں بہشتی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ روز دیکھتا ہوں پانی نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں؟"

اصغر کی دادی غالباً جاگ رہی تھیں کہنے لگیں بیٹا باورچی خانے میں سے لے لو" مگر اصغر کیوں جاتا۔ وہیں سے گیا اپنی والدہ کے سرہانے اور لگا انہیں جھنجھوڑنے "اماں! اماں! اے اماں!!" ان کی ابھی ابھی آنکھ لگی تھی یکلخت جو جاگنا پڑا بہت غصہ آیا کہنے لگیں۔ ہے ہے تجھے صبر بھی نہیں پڑتا" کسی کو سونے بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ سارا دن گرمی سے آنکھوں پر نیند حرام رہی اب ذرا سوئی تھی کہ یہ جلاد سر پر آن سوار ہُوا۔

تو میں کیا کروں" اصغر نے جھلا کے جواب دیا "گھڑوں میں پانی بھی ہو، مجھے اوپر جانا ہے۔"

تو میرے سر کیوں ہُوا ہے نامراد، کریمن مردار سے کہہ وہ نواب زادی تو سرِ شام ہی سو جاتی ہے۔ اسے کہہ تجھے پانی نکال کے دے۔ ایسی کاہل بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ توبہ ایسی نیند کی پیاری ہے کہ پانی تک نہیں رات کو بھر سکتی۔ اُٹھا اس کام چور کو اوکریمن ...... او کریمن ...... اے کریمن ......"

فیاض محمود

دوستی پچاس سال کے بعد بھی تازہ رہتی ہے۔ نفسانی جذبہ تین مہینے کے اندر باسی ہو جاتا ہے۔

صرف دوستی وہ پھول ہے جس میں کانٹے نہیں ہیں۔

ہم کہتے ہیں ہم اپنے دوست چنتے ہیں۔ لیکن دوست تو خود بخود چنے جاتے ہیں۔

دوستی وہ لفظ ہے جسے محض ایک صفحے پر لکھا دیکھ کر ہمارا جی خوش ہو جاتا ہے۔

دو ہو کر ایک محسوس کرنا یہ دوستی کا نصب العین ہے

گلچیں

غزلیات

ریاض عباسی

ہر سمت اُداسی چھائی ہے بے کیف ہوائیں آتی ہیں
آراستہ وضعِ ماتم سے تاریک گھٹائیں آتی ہیں

اور اس کے سوا کیا ہوتا ہی اس دنیا کے ہنگاموں میں
یا دل سے آہ نکلتی ہے یا لب پہ دعائیں آتی ہیں

یا بزمِ طرب ہوتی ہے بپا اک لمحے میں مٹ جانے کو
یا برسوں قائم رہنے کو جانکاہ بلائیں آتی ہیں

یا رنگِ الم میں ڈوبی ہوئی خوشیوں کی جھلک پڑجاتی ہے
یا نغموں کے پردوں میں چھپی غمگین صدائیں آتی ہیں

جو بات ہے سحرِ کامل ہے جو شے ہے فریبِ ہوش و نظر
اس زال کو بااین کبرِ سنی کیا مست ادائیں آتی ہیں

اور اس سے زیادہ کیا ہوگی ناکامیٔ قسمت عباسیؔ
ہم دیتے ہیں نذرِ مہر و وفا بدلے میں جفائیں آتی ہیں

محمد عبدالحی صدیقی

جب تجھ کو تعلق ہی نہیں کون و مکاں سے
پھر کوئی تجھے ڈھونڈے تو کس نام و نشاں سے

غم پر سہے غم اور نہ اُف نکلے زباں سے
میرا سا جگر کوئی مگر لائے کہاں سے

میں راہِ طلب میں ہوں وہ سرگشتہ و حیراں
ٹکراتا ہوں سر اپنا ہر اک سنگِ نشاں سے

کیوں تیری محبت میں ہے یہ بیخودیٔ دل
آگاہ نہیں میں بھی خود اس رازِ نہاں سے

کھل جاتے ہیں اسرارِ حقیقت کے خزانے
ملتی ہے نظر جب نگہِ پیرِ مغاں سے

وہ دولتِ غم دی ہے مجھے تیرے کرم نے
مطلب نہ رہا دہر کے کچھ سود و زیاں سے

تاثیرِ نگاہِ غلط انداز کے صدقے
پہنچا دیا یہ مجھ کو کہاں آج کہاں سے

کیا عبرتِ افسانہ بناؤ گے مجھی کو
کیوں سنتے ہو افسانہ مرا میری زباں سے

اے کاظمی جو حال ہے اب آپ کے دل کا
ظاہر ہے وہ خود آپ کے اندازِ بیاں سے

سیفی نوگانوی

سب پہ رحمت تھی مہربانی تھی
تھی تو ہم سے ہی سرگرانی تھی

موت کی نیند آگئی سن کر
زندگی بھی عجب کہانی تھی

اب کہاں ولولے طبیعت میں | خواب سا یاد ہے جوانی تھی
ہو برا اس عیالداری کا | خوش تو رہنے کی جی میں ٹھانی تھی
داغ بھی آج مٹ گیا افسوس | دل کی یہ ایک ہی نشانی تھی
سیفیؔ اب عشق کرکے پچھتائے | بات پہلے ہی کیوں نہ مانی تھی

جلیل قدوائی

پیشِ نظر نہیں ہے جو چھدن سے روئے دوست | بے چین کر رہی ہے بہت آرزوئے دوست
آنکھوں سے دور ہو بھی گئے وہ تو کیا ہوا | دل میں بسی ہوئی ہے تمنائے روئے دوست
گلزارِ عاشقی کی فضا پر بہار ہے | پھیلا ہوا ہے چار طرف رنگ و بوئے دوست
کانوں میں آرہی ہے برابر وہی صدا | بھولی نہیں ہے دل کو مرے گفتگوئے دوست
گونجی ہوئی فضا میں ہے وہ صوتِ جاں نواز | اللہ رے لطفِ سوزِ نوائے گلوئے دوست
ہیں منعکس تمام نقوشِ جمالِ یار | دل ایک آئینہ ہے کہ ہے روبروئے دوست
ہر دم بہارِ جلوۂ جاناں ہے نو بہ نو | حیراں ہوں دیکھ دیکھ کے جوشِ نموئے دوست
اقرار میں تو خیر نمایاں تھا لطفِ یار | انکار میں بھی ہائے وہ طرزِ نگوئے دوست
پروا نہیں جو راہِ محبت میں سر گیا | ہم جاں دے کے ہو تو گئے سرخروئے دوست
دیوانگی میں ہم نے یہ دل سے کہا تھا کل ق | تجھ کو قسم ہے آج سے دیکھے جو روئے دوست
لیکن جنونِ شوق کی آئی جو ایک لہر | مانا نہ وار چل ہی دئے ہم بہ کوئے دوست
زاہد! فریبِ ساغرِ کوثر جلیلؔ کو | جو کرچکا ہے بیعتِ جام و سبوئے دوست

رازؔ چاندپوری

پرستارِ محبت کو جلاتی ہے وہ کس دل سے | ملا موقع تو پوچھوں گا یہ نکتہ شمعِ محفل سے
کہاں کا قصد ہے اے ساکنانِ کوچۂ دنیا | کوئی آگاہ بھی ہے تم میں راہ و رسمِ منزل سے
صفا کیش و محبت خو، وفادار و خلوص آگیں | بہت دیکھے ہیں دنیا میں مگر ملتے ہیں مشکل سے
یہ بادہ، بادۂ سرجوشِ الفت، لے ترے قرباں! | جزاک اللہ، جزاک اللہ نکلتی ہے دعا دل سے
مبارک با دشتاقانِ روئے نیّرِ تاباں | طلوعِ ماہِ کامل ہے سوادِ خلوتِ دل سے
یہ اہلِ علم کی مجلس، یہ بزمِ شعر لے توبہ! | جنابِ رازؔ بھی واقف نہیں آدابِ محفل سے

ابوالبشر آدم علیہ السّلام

اور

نسلِ انسانی کی ابتدائی آبادی

یہ مضمون مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی مجوزہ "تاریخ ہند" کے مقدمے کا ایک باب ہے جو انہوں نے ہمایوں میں اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا ہے۔ "مقدمۂ تاریخ ہند" بجائے خود تین سو صفحات کی ایک کتاب ہے اور سلسلۂ "تاریخ ہند" کی پہلی جلد کے طور پر شائع ہوگا۔ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب تیس سال سے تاریخ ہند کے لئے ضروری مطالعہ اور سامان کی فراہمی اور ترتیب میں مصروف ہیں اور ہمیں مولانا کی مسلمہ قابلیت سے امید ہے کہ یہ کتاب لاجواب ہوگی۔ "مقدمۂ تاریخ ہند" کا مسودہ مکمل ہو چکا ہے لیکن افسوس کہ قلتِ سرمایہ کے باعث طباعت کا کچھ انتظام نہیں ہو سکتا۔ اگر کچھ علم دوست اصحاب اس سلسلے میں مولانا کی اعانت کر سکتے ہوں تو نجیب آباد کے پتے سے خط و کتابت فرمائیں۔ ناظرین کی واقفیت کے لئے مقدمے کے بعض اہم ابواب کا نام درج کیا جاتا ہے:- علم تاریخ کی اہمیت ۲۔ تاریخ اور اس کا موضوع ۳۔ علم تاریخ کی نسبت علماء و مورخین کے اقوال ۴۔ تنازع للبقا اور تاریخ ۵۔ تاریخ نویس کے صفات و فرائض ۶۔ اقوام عالم ۷۔ تقسیم اقوام باعتبار نسل ۸۔ تقسیم اقوام باعتبار تمدن ۹۔ تقسیم اقوام باعتبار مذہب ۱۰۔ اختلاف مذاہب کی حقیقت ۱۱۔ ایک ضروری معیارِ تحقیق و اصولِ تفتیش ۱۲۔ انسانی عمر کا پیمانہ اور عہد قدیم کی تاریخ ۱۳۔ آریا قوم کا قدیم وطن ۱۴۔ فارسی اور سنسکرت ۱۵۔ آریوں اور ایرانیوں کی مذہبی مماثلت ۱۶۔ آریا یا برہمن قوم کے متعلق ایک خیال ۱۷۔ ہندو اور آریا کی وجہ تسمیہ ۱۸۔ فنِ تحریر اور قدیم کتبے ۱۹۔ ہندوستان میں فنِ تحریر ۲۰۔ قدیم ہندو اور تاریخ نویسی ۲۱۔ ہندوؤں کے علوم اور کتابیں ۲۲۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں اور تاریخ عہدِ قدیم ۲۳۔ تاریخ ہند اور یورپین مورخین ۲۴۔ چینی سیاحوں کے سفرنامے اور تاریخ ہند قدیم ۲۵۔ ایرانی نوشتے اور تاریخ ہند قدیم ۲۶۔ شاہنامۂ فردوسی اور تاریخ ہند قدیم ۲۷۔ مسلم مورخین اور تاریخِ ہند قدیم ۲۸۔ زمانے کا تعین اور سن و سال کا استعمال۔

تمام انسانوں کے ایک جنس ہونے میں کسی کو کلام نہیں خواہ وہ منطقۂ باردہ کے اسکیمو ہوں یا منطقۂ حارّہ کے حبشی و سوڈانی، چین کے زرد رنگ قبائل ہوں یا انگلستان و فرانس کے سفید باشندے، ہندوستانی ہوں یا ایرانی عرب ہوں یا شامی غرض تمام انسان ایک جنس اور ایک نوع ہیں سب میں قوتِ گویائی یا نطق موجود ہے۔ سب کے سب پیدائشی طور پر ننگے اور محتاجِ لباس پیدا ہوئے ہیں۔ اعضائے جسمانی کی تعداد و ساخت سب کی یکساں ہے۔ آنکھ، کان ناک، ہاتھ، پاؤں، انگلیاں سب کی مشابہ ہیں۔ منطقۂ باردہ کا باشندہ اگر منطقۂ حارّہ میں آکر بود و باش اختیار کرنی چاہے تو کر سکتا ہے اور اس کی آئندہ پیدا ہونیوالی نسلیں منطقۂ حارّہ میں نشو و نما پا سکتی اور اس کو اپنا وطن بنا سکتی ہیں۔ چین کے باشندے اگر چاہیں تو انگلستان میں اور انگلستان کے باشندے اگر چاہیں تو آسٹریلیا میں سکونت اختیار کر سکتے ہیں۔ انسان تمام دوسرے جانداروں کا مخدوم اور ان سب سے اشرف و اعلیٰ ہے اس اشرف المخلوقات کو ایک نوع یا ایک آدمؑ کی اولاد تسلیم کرنے میں کوئی محال

لازم نہیں آتا بلکہ اس کے جسمانی و دماغی و روحانی قویٰ کی پیدائشی یکسانی مجبور کرتی ہے کہ تمام عالمِ انسانیت کو ایک باپ کی اولاد اور ایک خاندان تسلیم کیا جائے۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو چونکہ تمام ربعِ مسکون پر پھیلنے اور آباد ہونے کے لئے پیدا کیا ہے لہذا اُس کا ننگا پیدا ہونا ازبس ضروری تھا کہ جس ملک اور جس عرض البلد میں رہے وہیں کے حسبِ حال لباس تیار کر سکے۔ اگر بکری بیل بھینس وغیرہ جانوروں کی طرح اس کو محتاجِ لباس نہ بنایا گیا ہوتا تو جس طرح منطقہ حارّہ کا کوئی جانور منطقہ باردہ میں جاکر زندہ نہیں رہ سکتا اور منطقہ باردہ کا جانور مثلاً رینڈیر سوڈان و زنجبار میں لاکر زندہ نہیں رکھا جاسکتا اور اُس کی نسل نہیں چلائی جاسکتی اسی طرح سرد ملکوں کی رہنے والی انسانی نسلیں گرم ملکوں میں اور گرم ملکوں کے باشندے سرد ملکوں میں جاکر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر سرد ملکوں کے لئے ایک خاص قسم کے انسان خدا تعالیٰ پیدا کرتا اور گرم ملکوں کے لئے خاص قسم کے اور اس طرح ایک ایک نسل کے لئے ایک ایک ملک مخصوص کر دیا جاتا کہ ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک میں جانے کی استطاعت و قابلیت نہ رکھتا۔ تو تسلیم کیا جاسکتا تھا۔ کہ خدا تعالیٰ نے ابتداءً بہت سے آدمی مختلف ملکوں میں الگ الگ پیدا کئے تھے اور ہر ملک میں اسی ملک کے ایک بڑے باپ کی اولاد آباد ہے۔ اور دنیا کے تمام ملکوں میں ایک ہی باپ کی اولاد نہیں لیکن انسان کی موجودہ حالت صاف بتا رہی ہے۔ کہ تمام نوعِ انسان ایک باپ کی اولاد ہے۔

تمام جانداروں میں انسان کا ہمہ خور ہونا بھی اسی بات کو ثابت کر رہا ہے۔ کہ وہ ساری دنیا میں پھیلنے اور آباد ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر انسان کی غذا اسی طرح مخصوص و محدود و متعین ہوتی۔ جس طرح دوسرے جانوروں کی مخصوص ہے۔ تو ایک ملک کا انسان دوسرے ملک میں جاکر ہرگز زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ تمام ملکوں میں یکساں نباتات پیدا نہیں ہوسکتے۔ بعض سرد ملکوں میں نباتات کا قطعاً وجود نہیں مگر انسان وہاں بھی موجود ہے۔ جاسکتا ہے۔ رہ سکتا ہے اور وہاں حیوانی غذا پر زندگی بسر کرسکتا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جن ملکوں میں بارہ مہینے زمین پر برف جمی رہتی ہے وہاں ایسی قسم کے جانور موجود ہیں جو برف پر گاڑیاں کھینچتے اور انسان کی خدمت کرتے ہیں۔ جن ملکوں میں طویل وعریض ریگستان ہیں وہاں اونٹ موجود ہے اور انسان کی خدمت گزاری بجالاتا ہے جس ملک میں گھوڑے کی ضرورت ہے وہاں گھوڑے اور جہاں بیل کی ضرورت ہے وہاں بیل موجود ہیں غرض اس مخدوم کے لئے ہر جگہ حسبِ ضرورت خادم مہیا کر دئے گئے ہیں اس کو خود اپنے ساتھ اپنے خادم لے جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ ہر ملک میں وہاں کے موجودہ خدام سے کام لینے کی قابلیت رکھتا ہے اور ہر جگہ اپنا کام نکال لیتا ہے۔ یہ بھی دلیل اس بات کی ہے کہ انسان دنیا کے ہر ملک میں آباد ہونے، ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جانے اور وہاں سکونت اختیار کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے یعنی انسان میں فطری طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں چلنے پھرنے سکونت تبدیل کرنے اور دنیا کے ہر گوشے کو آباد کر دینے کی قابلیت رکھی گئی ہے۔ پس کسی سمجھدار شخص کو اس بات کے تسلیم کرنے

میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ نوعِ انسان ایک آدم کی اولاد ہے اور ساری دنیا اس کا وطن ہے۔

بعض اقوام کی قومی و مذہبی[1] روایات کے بموجب خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے جس جنت میں رکھا تھا وہ علاقۂ عدن میں تھی اور وہیں سے اولادِ آدم تمام دنیا میں پھیل گئی اور طوفان کے بعد دامنِ کوہِ جودی میں نوح علیہ السلام کشتی سے اترے اور شام و عراق میں انسانی نسل آباد ہوئی اور وہاں سے تمام دنیا میں پھیلی۔ بعض لوگوں نے آدم علیہ السلام کی جنت چین و ترکستان میں تجویز کی اور سیحوں اور جیحوں کو جنت کی نہریں بتایا ہے۔ بعض نے اس سے اور بھی اوپر چل کر شمال کے قطبی علاقے کو جو آج کل برف سے ڈھکا ہوا ہے آدمؑ کی جنت تجویز کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برہما نے پرمیشر کے حسبِ منشا منو یا منش یا آدمِ اول کو ہندوستان میں پیدا کیا اور ہندوستان سے انسانی نسل تمام دنیا میں منتشر ہوئی۔ ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ کشمیر و تبت نسلِ انسانی کا ابتدائی وطن تھا۔

موجودہ زمانے کے مفتشین کا خیال ہے کہ اس زمین پر سب سے پہلے چین و ترکستان کے بلند مقامات میں نباتات کا ظہور ہوا اور آج تک بھی چین و ترکستان کے یہی بلند مقامات سب سے زیادہ سرسبزی و روئیدگی کی اہلیت رکھتے ہیں لہذا انسان بھی اسی جگہ سب سے پہلے پیدا ہوا کیونکہ اس کی غذا بافراط اسی جگہ پہلے موجود کی گئی تھی۔ وہ جانور بھی جن کی انسان کو اپنی زندگی بسر کرنے میں زیادہ ضرورت پیش آتی ہے اسی جگہ سب سے پہلے موجود ہوے۔ اس طرح ایک عرصۂ دراز تک ابتدائی انسانی خاندان اس علاقے میں پرورش پاتا رہا۔ جب انسانوں کی کثرت ہوئی اور وہاں کی پیداوار اور ضروریاتِ زندگی انسانوں کی کثرت کے سبب ناکافی ثابت ہونے لگیں تو آپس میں لوازمِ زندگی پر خود قبضہ کرنے اور دوسروں کو محروم رکھنے کی وجہ سے مخالفت اور منازعت پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور طاقتور جماعتوں نے کمزوروں کو وہاں سے جلاوطن ہونے اور قرب و جوار کے دوسرے علاقوں اور ملکوں میں چلے جانے پر مجبور کیا۔ کچھ لوگ وہاں سے شمال و مشرق یعنی منچوریا اور رکمسکٹکا کی طرف چلے گئے۔ کچھ شمال و مغرب یعنی روس و یورپ کی طرف منتقل ہو گئے۔ کچھ ایران و خراسان اور کچھ تبت و ہندوستان کی طرف چلے آئے۔ جن جن علاقوں میں جا کر یہ مہاجرین آباد ہوئے کچھ عرصے کے بعد اور قبائل اُس اصل مرکز سے پہلوں کی طرح ترکِ سکونت پر مجبور ہو کر اُن سے آ ملے۔ ان جدید علاقوں میں بھی وہی صورت پیش آئی اور انسانوں کی کثرت نے طاقتوروں کے ہاتھوں کمزوروں کو بیدخل ہونے اور اور جدید علاقوں میں جا کر سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ یہ عمل ہزارہا سال تک برابر جاری رہا اور طاقتور گروہوں کے سامنے سے کمزور گروہ ہٹتے اور دنیا میں پھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ جنوبی افریقہ، مغربی یورپ، جنوبی ہند اور جزیرہ نما ملایا تک انسان پہنچ گئے۔ ملکوں کی آب و ہوا، عرض البلد کی حرارت و برودت۔ غذاؤں کی خصوصیت نے رنگتوں، جسموں اور خط و خال پر اثر ڈالا اور دنیا میں مختلف قومیں نظر آنے لگیں۔ جزیرہ نما کمسکٹکا چونکہ اس قدیم زمانے میں امریکا سے ملا ہوا تھا لہذا شمالی چین کی طرف منتقل ہونے والے قبائل کا ایک حصہ امریکہ میں پہنچ گیا اور انہیں لوگوں

[1] توریت کتاب پیدائش

کی اولاد امریکا کے اصلی باشندے ہیں جن کو ریڈ انڈین (Red Indians) کہتے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا میں اب بھی یہ تاثیر ہے کہ جو یورپی نسلیں وہاں جاکر آباد ہوئی ہیں اُن کی رنگتوں میں ریڈ انڈین کے رنگ کی ایک خفیف سی جھلک پیدا ہونے لگی ہے اور ہزارہا سال اور سیکڑوں نسلیں گزرنے کے بعد یہ یورپ سے گئی ہوئی سفید نسلیں یقیناً ریڈ انڈین کے موجودہ تانبڑے رنگ میں رنگین ہوجائیں گی۔ ترکستان و چین کی سطحِ مرتفع کو انسانی نسل کا ابتدائی گہوارہ بتانے والوں کا قول اِس وقت دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ قبول سمجھا گیا ہے ورنہ اس سے پہلے بحیرۂ کاسپین کے متصلہ علاقے یا پامیر و تبت کے پہاڑوں یا ایران کے میدانوں کو علمائے یورپ نے نسلِ انسانی کا ابتدائی گہوارہ قرار دیا تھا۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا مختلف مورخین کے خیالات و قیاسات کا مجمل سا خاکہ ہے لیکن زیرِ بحث مضمون پر ایک اور طرح بھی غور کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ علمِ ہیئت، علمِ طبقات الارض اور سائنس و طبیعات وغیرہ علوم کے جاننے والے علمائے تحقیق عالم کے متعلق غور کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابتداً یہ زمین ہوائی شکل کا ایک کرہ تھی پھر اس نے مائی شکل اختیار کی اس کے بعد حرارت جب کسی قدر کم ہوئی تو منجمد ہونا شروع ہوئی۔ یہ انجماد کا فعل بیرونی سطح سے شروع ہُوا اور اندر کی حرارت نے بیرونی منجمد سطح کو بار بار درہم برہم کیا۔ اس طرح ہزاروں یا لاکھوں سال کے عمل سے بہت سے پہاڑ وجود میں آئے اور قدرے سکون پیدا ہُوا۔ پھر حرارت جب اور بھی کم ہوگئی تو وہ لطیف ذرّات جو بھاپ کی شکل میں بطورِ غلاف چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے تھے پانی کی صورت اختیار کرکے سطحِ زمین کے نشیبی حصوں میں جاگزیں ہوئے اور سمندر موجود ہوگئے ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ۔ اور زیادہ زمانہ گزرنے پر جب زمین کی حرارت زیادہ کم ہوگئی تو نباتات پیدا ہونے لگی۔ اس کے بعد حیوانات نمایاں ہوئے۔ پھر انسان پیدا ہوئے۔ زمین کے بیرونی حصّے کی حرارت تیز رفتاری سے زائل ہوئی اور جوں جوں بیرونی حصہ زیادہ سرد اور منجمد ہوتا گیا اندرونی حصے کی حرارت کے زائل ہونے کی رفتار سست ہوتی گئی۔ آج کل علمائے طبقات الارض نے ثابت کیا ہے کہ سطحِ زمین کے نیچے ستائیس میل کی گہرائی میں اس قدر حرارت موجود ہے کہ وہاں فولاد پگھل کر پانی کی مانند رقیق ہوجائیگا۔ ایک زمانہ زمین پر ایسا گزرا ہے کہ اس کی بیرونی سطح پر فولاد پگھل سکتا تھا اور ایک زمانہ ایسا آئےگا کہ بجائے ستائیس میل کی گہرائی کے سو میل کی گہرائی پر فولاد کو پگھلانے والی حرارت مل سکے گی۔ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ زمین کی حرارت شروع سے لے کر اب تک بتدریج کم ہورہی ہے۔ انسان اس زمین پر اُسی وقت پیدا کیا گیا ہے جبکہ وہ پیدا ہوکر زمین پر زندہ رہ سکتا تھا۔ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ۔ پس اس سے پہلے زمین پر اگر کوئی ذی روح مخلوق ہوگی تو وہ انسان کے سوا ایسی مخلوق ہوگی جو سخت حرارت میں زندہ رہ سکتی ہو اور نباتات کی بجائے کوئلے یا انگارے کھاکر جی سکتی ہو اور ہم اس مخلوق کو آتشی مخلوق ہی کہہ سکتے ہیں۔ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ۔

یہ بات بھی بالکل عیاں اور مُسلّم ہے کہ زمین سب سے پہلے قطبین کی طرف سے سرد ہونی شروع ہوئی تھی یہی وجہ

ہے کہ سب سے زیادہ سردی قطبین کی جانب پائی جاتی ہے۔ قطب جنوبی کی جانب تو کوئی قابلِ تذکرہ قطعۂ زمین ہے نہیں اگر کوئی بے حقیقت جزیرہ اُس نواح میں ہو بھی تو اُس کے تعلقات ربع مسکون سے قائم نہیں ہو سکتے تھے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ منطقۂ باردۂ شمالی سب سے پہلے اس قابل ہُوا تھا کہ وہاں انسان پیدا ہو کر زندہ رہ سکے۔ اُس زمانے میں منطقۂ معتدلہ اور منطقۂ حارّہ اس قدر زیادہ گرم ہوں گے کہ انسان ان ملکوں میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ خداتعالیٰ نے منطقۂ باردۂ شمالی کے مرکزی حصے میں جہاں آج کل بارہ مہینے زمین برف سے ڈھکی رہتی ہے آدم اول کو پیدا کیا ہوگا۔ جوں جوں زمین سرد اور انسان کے لئے موزون ہوتی گئی آدم کی اولاد عرض البلد شمالی سے عرض البلد جنوبی کی طرف اترتی اور پھیلتی گئی مثلاً ایک حصہ سائبیریا منچوریا اور چین کی طرف۔ دوسرا حصہ ناروے۔ سوئڈن۔ یورپی روس اور یورپی ممالک کی طرف اور تیسرا حصہ گرین لینڈ اور شمالی امریکا کی طرف بڑھنا اور پھیلنا شروع ہُوا اور رفتہ رفتہ تمام دنیا اولادِ آدم سے آباد ہو گئی۔ چونکہ نسل انسانی کی ابتدا زمین پر شمالی علاقے میں ہوئی اور شمال کی جانب سے انسان جنوب یا جنوب و مشرق اور جنوب و مغرب کی طرف متفرع اور منتشر ہوئے۔ لہٰذا عہدِ قدیم کی تاریخوں اور باستانی حکایات اور قوموں کی پرانی روایات پر غور کرنے سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا قوی سبب حائل اور مانع نہ ہُوا تو عام حالات میں شمالی علاقوں کے باشندوں کو جنوبی علاقوں پر حملہ آور ہونے میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ شمالی یورپ کی قوموں نے جنوبی یورپ کے علاقوں پر جس قدر کامیاب حملے کئے جنوبی یورپ کو شمالی یورپ پر حملہ آور ہونے میں اس قدر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ترکوں نے ایرانیوں پر بار بار فتح حاصل کی لیکن ایرانیوں کو ترکستان پر قابض ہونے کا موقع بہت کم ملا۔ ہندوستان پر اقوام نے شمال و مشرق اور شمال و مغرب سے بار بار حملے کئے لیکن ہندوستان والوں کو شمالی علاقوں پر حملہ آور ہو کر فتح مند ہونے کا بہت ہی کم موقع ملا۔ اسی طرح شمالی ہند نے جنوبی ہند کو بار بار مفتوح و مغلوب کیا لیکن جنوبی ہند کو شمالی ہند پر چیرہ دست ہونے کا موقع بہت کم ملا۔ مصر کو یونانیوں اور اطالویوں اور شامیوں نے بار بار فتح کیا لیکن مصر کو ان حملہ آوروں کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا شاذونادر ہی موقع میسر ہُوا اسی طرح نے مصریوں نے سوڈان وغیرہ جنوبی علاقوں پر اپنا اقتدار بآسانی قائم کیا لیکن سوڈانیوں کو مصر کے فتح کرنے کا موقع کمتر میسر آیا۔ یہ بھی دلیل اس بات کی ہے کہ انسان شمال سے جنوب کی طرف بآسانی اپنے آپ کو پہنچا سکا ہے جنوب سے شمال کی طرف بڑھنا اُس کے لئے زیادہ دشواری کا موجب رہا ہے۔ بنا بریں اُس کا قدیمی گہوارہ ہم کو شمالی علاقوں میں ہی تلاش کرنا چاہئے اور بآسانی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ نسلِ انسانی کا ابتدائی وطن منطقۂ باردہ یعنی قطبِ شمالی کا وہ علاقہ تھا جو آج کل بارہ مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے اور جو کسی زمانے میں سب سے زیادہ سرسبز و خوشگوار علاقہ تھا اور جہاں آج کل دنیا کی سب سے زیادہ غیر متمدن قوم اسکیمو سکونت پذیر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اکبر شاہ خاں

ـــــــــــــــــ

وطن کی یاد میں

اے خاکِ وطن جہانِ اُمید — ہر شام ہے تیری رشکِ صد عید
ہر سمت سکون و راحت افزا — ذرّے ہیں مسرتوں کی دنیا
ابھرے ہوئے نقش جانفزیت — ہر خار بہارِ باغِ نزہت
اللہ رے تیرا وہ نازِ رنگیں — دیتا ہے فلک خراجِ تحسیں
اللہ تیری بسی ہوئی ہوائیں — ڈوبی ہوئی زردیں فضائیں
بہتے ہوئے عشرتوں کے دریا — چلتی ہوئی کشتیٔ تمنا
اے گلکدۂ سرور میں بھی — اپنا تھا فضا میں سانس لیتی
دنیا کی مسرتیں تھیں حاصل — ہر فکرِ جہاں تھی نقشِ باطل
وہ بزم وہ چاندنی کی راتیں — احباب کی دلنواز باتیں
یاروں کی وہ سامعہ نوازی — تاروں کی فضا بھی جھومتی تھی
برسات میں بانسری کے نغمے — اور اس پہ ہوا کے سرد جھونکے

ہر سمت تھی عشرتِ فراواں — تجدیدِ حیات کے تھے ساماں
جاڑوں میں الاؤ کے کنارے — سب دوست عزیز بیٹھتے تھے
کس لطف سے کمسنی کے قصے — کہتے تھے خوشی سے جھومتے تھے
شاداب تھا مزرعِ تمنا — کھیتوں کی وہ روز سیر کرنا
سبزہ کا نظر نواز منظر! — ابتک ہیں نقوش جس کے دل پر
صد حیف وہ انجمن نہیں ہے — سب کچھ ہے مگر وطن نہیں ہے
فرقت کا الم ہے اور میں ہوں — احباب کا غم ہے اور میں ہوں
ہے ارضِ دکن اگرچہ جنت — لیکن وہ کہاں وطن کی صحبت
دل میں وہ شگفتگی نہیں ہے — پردیس میں زندگی نہیں ہے
اے کاش پہنچ رہوں وطن میں — کھنچ جائیں زمین کی طنابیں
ہاں خاکِ وطن کشش دکھا کر — غربت کے الم کا خاتمہ کر

منظور حسین ماہر القادری
(از حیدرآباد دکن)

کفّارہ

(منشی پریم چند)

دفتر میں ذرا دیر سے آنا افسری کی شان ہے، جتنا بڑا حاکم ہوتا ہے اتنی ہی دیر میں آتا ہے۔ اور اتنی ہی جلدی جاتا ہے پچپراسی کی حاضری چوبیسوں گھنٹے کی ہوتی ہے، وہ چھٹی بھی نہیں جاسکتا، عوض دینا پڑتا ہے، خیر جب بریلی ضلع بورڈ کے ہیڈ کلرک بابو مداری لال گیارہ بجے دفتر آئے تو گویا دفتر نیند سے جاگ اُٹھا، چپراسی نے دوڑ کر سائیکل لی، اردلی نے دوڑ کر کمرے کی چک اُٹھا دی، اور جمعدار نے ڈاک کی کشتی لاکر میز پر رکھ دی، مداری لال نے پہلا ہی سرکاری لفافہ کھولا تھا کہ اُن کا رنگ فق ہو گیا، وہ کئی منٹ تک سکتے کی حالت میں کھڑے رہے، جیسے تمام حواس معطل ہو گئے ہوں، ان پر بہت سے حوادث پڑ چکے تھے مگر وہ اتنے بدحواس کبھی نہیں ہوئے تھے، بات یہ تھی کہ بورڈ کے سیکرٹری کی جو جگہ ایک مہینے سے خالی تھی۔ اس پر حکومت نے سبودھ چندر کو مقرر کیا تھا۔ اور سبودھ چندر وہ شخص تھا جس کے نام سے ہی مداری لال کو نفرت تھی، وہ سبودھ چندر جو ان کا کلاس فیلو تھا، جسے زک دینے کے لئے انہوں نے بارہا کوشش کی تھی اور کبھی کامیاب نہیں ہوئے تھے، وہی سبودھ آج اُن کا افسر ہو کر آرہا تھا، اُدھر کئی برسوں سے سبودھ کی کوئی خبر نہ تھی، اتنا معلوم تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا، مداری لال نے سمجھا تھا کہ وہیں مر گیا ہو گا، مگر آج وہ گویا جی اٹھا تھا۔ اور سیکرٹری ہو کر آرہا تھا۔ مداری لال کو اس کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے گا، اس بے عزتی سے تو مر جانا ہی کہیں بہتر تھا، سبودھ کو اسکول اور کالج کی ساری باتیں ضرور ہی یاد ہوں گی، مداری لال نے کئی بار اُسے کالج سے نکلوا دینے کی تدبیریں کیں۔ غلط الزام عائد کئے۔ بدنام کیا، کیا سبودھ سب کچھ بھول گیا ہو گا؟ نہیں، ہرگز نہیں، وہ آتے ہی پرانی کسر نکالے گا۔ مداری بابو کو جان بچانے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی ؂

مداری اور سبودھ کے ستاروں ہی میں اختلاف تھا، دونوں ایک ہی روز ایک ہی اسکول میں داخل ہوئے، اور پہلے ہی روز دل میں بُغض و حسد کی وہ چنگاری پڑ گئی جو آج بیس برس گذرنے پر بھی نہ بجھی تھی، سبودھ کا قصور یہی تھا کہ وہ ہر بات میں مداری لال سے بڑھا ہوا تھا، قد و قامت، رنگ و نقشہ، سلوک اور برتاؤ، علم و عقل، غرض تمام باتوں میں وہ فائق تھا، مداری لال نے اس کا یہ قصور کبھی معاف نہیں کیا، سبودھ بیس برس تک برابر اس کے دل کا کانٹا بنا رہا، جب سبودھ پاس ہو کر اپنے مکان چلا گیا اور مداری لال فیل ہو کر اس دفتر میں نوکر ہو گئے تو ان کا دل ٹھنڈا ہوا اور جب یہ معلوم ہوا کہ سبودھ چندر بصرے جا رہا ہے تو مداری لال کا چہرہ

شگفتہ ہوگیا، ان کے دل سے وہ پرانی پھانس نکل گئی، پروائے بدنصیبی کہ وہ پرانا ناسور دس گنا ٹیس اور جلن کے ساتھ کھل گیا، آج ان کی قسمت سبودھ کے ہاتھ میں تھی ۔

جب ذرا دل ٹھکانے ہوا تو مداری نے دفتر کے کلرکوں کو حکم سناتے ہوں کہا ـــ اب آپ لوگ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہیئے گا، سبودھ وہ آدمی نہیں ہیں جو بھولوں کو معاف کردیں گے ۔

ایک کلرک نے پوچھا " کیا بہت سخت ہیں ؟"

مداری لال نے مسکراکر کہا ـــ " وہ تو آپ لوگوں کو دو ہی چار دنوں میں معلوم ہو جائے گا، میں اپنے منہ سے کسی کی کیوں شکایت کروں، بس ہوشیار کردیا۔ ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہیئے گا، آدمی قابل ہیں۔ مگر بڑے ہی غصہ ور اور سخت، غصہ تو اُن کی ناک پر رہتا ہے۔ خود ہزاروں ہضم کر جائیں اور ڈکار تک نہ لیں مگر کیا مجال جو کوئی ماتحت ایک کوڑی تو ہضم کرنے پائے۔ ایسے آدمی سے خدا ہی محفوظ رکھے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ چھٹی لے کر گھر چلا جاؤں، دونوں وقت گھر پر حاضری دینی ہوگی، آپ لوگ آج سے سرکار کے نوکر نہیں سیکرٹری صاحب کے نوکر ہیں، کوئی ان کے لڑکے کو پڑھائے گا، کوئی بازار سے سودا سلف لائے گا، اور کوئی انہیں اخبار سنائے گا، اور چپراسی تو شاید دفتر میں نظر ہی نہ آئیں" ۔

اس طرح سارے دفتر کو سبودھ چندر کی جانب سے بھڑکا کر مداری لال نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا ۔

(۲)

اس کے ایک ہفتہ بعد سبودھ چندر گاڑی سے اترے تو اسٹیشن پر دفتر کے سب کارکنوں کو حاضر پایا۔ سب اُن کا استقبال کرنے آئے تھے۔ مداری لال کو دیکھتے ہی سبودھ لپک کر ان کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے۔ تم خوب ملے بھائی ! یہاں کیسے آئے ؟ ایک زمانے کے بعد ملاقات ہوئی ۔

مداری لال بولے " یہاں ضلع بورڈ کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہوں، آپ تو خیریت سے ہیں ؟"

سبودھ ـــ اجی، میری نہ پوچھو، بصرہ، فرانس، مصر اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا، تم دفتر میں ہو، یہ بہت اچھا ہوا، میری تو سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا، میں تو بالکل کورا ہوں، لیکن جہاں جاتا ہوں، میری خوش نصیبی بھی ساتھ جاتی ہے، بصرے میں سبھی افسر خوش تھے، فرانس میں بھی خوب مزے اڑائے، دو برس میں پچیس ہزار روپے پیدا کئے اور سب اُڑا دیئے، وہاں سے آکر کچھ دنوں کوآپریشن کے دفتر میں مٹرگشت کرتا رہا۔ یہاں آیا تو تم مل گئے ۔

(کلرکوں کو دیکھ کر) یہ لوگ کون ہیں ؟

مداری لال کے کلیجے پر برچھی سی چل رہی تھی، بدمعاش پچیس ہزار روپے بصرے سے کما لایا۔ یہاں قلم گھستے گھستے مرگئے۔ پانسو بھی جمع نہ کرسکے، "یہ بورڈ کے کارکن ہیں، اسلام کرنے آئے ہیں" ۔

سبودھ نے ان سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور بولا۔ آپ لوگوں نے فضول یہ تکلیف اٹھائی، بہت ممنون ہوں،

مجھے امید ہے کہ آپ صاحبوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی، مجھے اپنا افسر نہیں اپنا بھائی سمجھئے، آپ سب لوگ مل کر اس طرح دفتر کا کام کیجئے کہ بورڈ کی نیک نامی ہو، اور میں بھی سرخ رو ہوں، آپ کے ہیڈ کلرک صاحب تو میرے پرانے دوست اور لنگوٹیا یار ہیں۔

ایک کلرک نے کہا ـــ ہم سب حضور کے فرمانبردار ہیں حتی الامکان آپ کو ناخوش نہ کریں گے۔ لیکن انسان ہی ہیں۔ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو حضور اسے معاف فرمائیں گے۔

سبودھ نے نرمی سے کہا ـــ یہی میرا اصول ہے، ہمیشہ یہی اصول رہا۔ جہاں رہا ماتحتوں سے دوستوں کا سا برتاؤ کیا ہم اور آپ دونوں کسی تیسرے کے غلام ہیں پھر اقتدار کیسا اور افسری کیسی۔ ہاں ہمیں نیک نیتی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

جب سبودھ سے رخصت ہو کر کارکن لوگ چلے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

"آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے"۔

"ہیڈ کلرک کے کہنے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو کچا کھا جائے گا"۔

"پہلے سبھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں"۔

"یہ دکھانے کے دانت ہیں"۔

(۴)

سبودھ کو آئے ایک مہینہ گذر گیا۔ بورڈ کے کلرک، اردلی، چپراسی سبھی اس کے برتاؤ سے خوش ہیں۔ وہ اتنا خوش مزاج ہے۔ اتنا نیک ہے کہ جو اس سے ایک بار ملتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اس کا دوست ہو جاتا ہے سخت لفظ تو اس کی زبان پر آتا ہی نہیں۔ انکار کو بھی وہ ناگوار نہیں ہونے دیتا۔ لیکن بغض وحسد کی نگاہوں میں ہنر اور بھی ہولناک ہو جاتا ہے۔ سبودھ کے یہ تمام اوصاف مداری لال کی نظروں میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی نہ کوئی خفیہ چالیں سوچتے ہی رہتے ہیں۔ پہلے کارکنوں کو بھڑکانا چاہا۔ کامیاب نہ ہوئے۔ بورڈ کے ممبروں کو بھڑکانا چاہا۔ منہ کی کھائی۔ ٹھیکہ داروں کے ابھارنے کا بیڑا اُٹھایا۔ شرمندہ ہونا پڑا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ بھس میں آگ لگا کر آپ دور سے تماشا دیکھیں۔ سبودھ سے یوں ہنس کر ملتے یوں چکنی چپڑی باتیں کرتے۔ گویا اس کے سچے دوست ہیں۔ مگر گھات میں لگے رہتے۔ سبودھ میں اور سب قابلیت تھی مگر آدمی پہچاننا نہ جانتے تھے۔ وہ مداری لال کو اب بھی اپنا دوست ہی سمجھتے تھے۔

ایک روز مداری لال سیکرٹری صاحب کے کمرے میں گئے۔ تو کرسی خالی دیکھی۔ وہ کسی کام سے باہر چلے گئے تھے۔ اُن کی میز پر پانچ ہزار کے نوٹ پلندے میں بندھے ہوئے رکھے تھے۔ بورڈ کے مدرسوں کے لئے لکڑی کا کچھ سامان بنوایا گیا تھا۔ اسی کے روپے تھے، ٹھیکہ دار وصولی کے لئے بلایا گیا تھا۔ آج ہی سیکرٹری صاحب نے خزانے سے روپے منگوائے تھے۔ مداری لال نے برآمدے میں جھانک کر دیکھا۔ سبودھ کا کہیں پتہ نہیں۔ ان کی نیت بدل گئی۔ حسد

میں لالچ کی آمیزش ہوگئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلندے اُٹھائے۔ پتلون کی دونوں جیبوں میں بھر کر فوراً کمرے سے نکلے۔ اور چپراسی کو پکار کر بولے۔ بابو جی اندر ہیں ؟

چپراسی آج ٹھیکہ دار سے کچھ وصول کرنے کی خوشی میں پھولا ہوا تھا۔ سامنے والے تنبولی کی دکان سے آ کر بولا — جی نہیں۔ کچہری میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی تو گئے ہیں۔

مداری لال نے دفتر میں آ کر ایک کلرک سے کہا۔ یہ مثل لے جا کر سکریٹری صاحب کو دکھاؤ۔

کلرک مثل لے کر چلا گیا۔ اور ذرا دیر میں لوٹ کر بولا — سکریٹری صاحب کمرے میں نہ تھے۔ فائل میز پر رکھ آیا ہوں۔

مداری لال نے منہ سکوڑ کر کہا — کمرہ چھوڑ کر کہاں چلے جایا کرتے ہیں! کسی روز دھوکا کھائیں گے۔

کلرک نے کہا — ان کے کمرے میں دفتر والوں کے سوا جاتا ہی کون ہے ؟

مداری لال نے تند لہجے میں کہا — تو کیا دفتر والے سب معصوم ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کس کی نیت بدل جائے۔ میں نے چھوٹی چھوٹی رقموں پر اچھے اچھوں کی نیتیں بدلتے دیکھی ہیں۔ اس وقت ہم سبھی ایماندار ہیں۔ لیکن موقع پا کر شاید ہی کوئی چوکے۔ انسان کی یہی فطرت ہے۔ آپ جا کر ان کے کمرے کے دونوں دروازے بند کر دیجئے۔

کلرک نے ٹال کر کہا — چپراسی تو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے۔

مداری لال نے جھنجھلا کر کہا۔ آپ سے جو میں کہتا ہوں وہ کیجئے۔ کہنے لگے چپراسی بیٹھا ہے۔ چپراسی کوئی رشی ہے منی ہے؟ چپراسی ہی کچھ اڑا دے تو آپ اس کا کیا کر لیں گے۔ ضمانت بھی ہے تو تین سو کی۔ یہاں ایک ایک کاغذ لاکھوں کا ہے۔

یہ کہہ کر مداری لال خود اُٹھے۔ اور دفتر کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دیے۔ جب ذرا مزاج ٹھکانے ہوا۔ تو نوٹوں کے پلندے جیب سے نکال کر ایک الماری میں کاغذوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیے۔ پھر آ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

سبودھ چندر کوئی گھنٹے بھر میں لوٹے۔ اس وقت ان کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دفتر میں آ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ میرا کمرہ کس نے بند کر دیا ہے بھائی ؟ کیا میری بیدخلی ہو گئی ؟

مداری لال نے کھڑے ہو کر طنز کے انداز میں کہا۔ صاحب! گستاخی معاف ہو۔ آپ جب کبھی باہر جائیں۔ خواہ ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو تو دروازہ ضرور بند کر دیا کریں۔ آپ کی میز پر روپے پیسے اور سرکاری کاغذات بکھرے پڑے رہتے ہیں۔ نہ جانے کس وقت کس کی نیت بدل جائے۔ میں نے ابھی سُنا کہ آپ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ تو دروازے بند کرا دیئے۔

سبودھ دروازہ کھول کر اندر گئے۔ اور ایک سگار پینے لگے۔ میز پر نوٹ رکھے ہوئے ہیں، اس کی خبر ہی نہ تھی۔

ناگہاں ٹھیکہ دار نے آ کر سلام کیا۔ سبودھ کرسی سے اُٹھ بیٹھے۔ اور بولے — تم نے بہت دیر کر دی۔ تمہارا ہی

انتظار کر رہا تھا۔ دس ہی بجے روپے منگوا لیئے تھے۔ رسید کا ٹکٹ لائے ہو نا؟

ٹھیکہ دار — حضور۔ رسید لکھنا لایا ہوں۔

سبودھ — تو اپنے روپے لے جاؤ۔ تمہارے کام سے میں زیادہ خوش نہیں ہوں۔ لکڑی تم نے اچھی نہیں لگائی۔ اور کام میں صفائی بھی نہیں ہے۔ اگر ایسا کام پھر کرو گے تو ٹھیکہ داروں کے رجسٹر سے تمہارا نام خارج کر دیا جائے گا۔

یہ کہہ کر سبودھ نے میز پر نگاہ ڈالی۔ تو نوٹوں کے پلندے نہ تھے۔ سوچا شاید کسی فائل کے نیچے دب گئے ہوں۔ کرسی کے پاس کے سب کاغذ الٹ پلٹ کر ڈالے۔ مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔ ایں۔ نوٹ کہاں گئے! ابھی یہیں تو میں نے رکھ دیئے تھے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔ پھر فائلوں کو اُلٹنے پلٹنے لگے۔ دل میں ذرا ذرا دھڑکن ہونے لگی۔ ساری میز کے کاغذ چھان ڈالے۔ پلندوں کا پتہ نہیں۔ اس وقت وہ کرسی پر بیٹھ کر اس گھنٹہ بھر کے اندر گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگے۔

چپراسی نے نوٹوں کے پلندے لا کر مجھے دیے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ اور بھلا یہ بھی بھولنے کی بات ہے اور جلدی میں میں نے نوٹوں کو لے کر یہیں میز پر رکھ دیا۔ گنا تک نہیں۔ پھر وکیل صاحب آ گئے۔ پرانے ملاقاتی ہیں۔ ان سے باتیں کرتا ہوا ذرا اس درخت تک چلا گیا۔ انہوں نے پان منگوائے۔ بس اتنی ہی دیر ہوئی۔ جب گیا ہوں تو پلندے رکھے ہوئے تھے۔ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ پھر یہ نوٹ کہاں غائب ہو گئے۔ میں نے کسی صندوق۔ دراز یا الماری میں نہیں رکھے۔ پھر گئے تو کہاں! شاید دفتر میں کسی نے احتیاط کے خیال سے رکھ لئے ہوں۔ یہی بات ہے۔ فضول اس قدر گھبرا گیا۔

فوراً دفتر میں آ کر مداری لال سے بولے — "آپ نے میری میز پر سے نوٹ تو اٹھا کر نہیں رکھ دیئے؟"

مداری لال نے متوحش ہو کر کہا — کیا آپ کی میز پر نوٹ رکھے ہوئے تھے؟ مجھے تو خبر نہیں۔ ابھی پنڈت سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے۔ تو آپ کو کمرے میں نہ دیکھا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ کسی سے باتیں کرنے چلے گئے ہیں تو دروازے بند کرا دیے۔ کیا کچھ نوٹ نہیں مل رہے ہیں؟

سبودھ آنکھیں پھیلا کر بولے — ارے صاحب! پورے پانچ ہزار کے ہیں۔ ابھی چک بھنایا ہے۔

مداری لال نے سر پیٹ کر کہا — پورے پانچ ہزار! یا بھگوان! آپ نے میز پر خوب دیکھ لیا؟

"اجی پندرہ منٹ سے تلاش کر رہا ہوں۔"

"چپراسی سے پوچھ لیا کہ کون کون آیا تھا؟"

"آیئے ذرا آپ لوگ بھی تلاش کیجئے۔ میرے تو ہوش اُڑے ہوئے ہیں۔"

سارا دفتر سیکرٹری صاحب کے کمرے کی تلاشی لینے لگا۔

میز۔ الماریاں۔ صندوق سب دیکھے گئے۔ رجسٹروں کے ورق الٹ الٹ کر دیکھے۔ مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں اب اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ کوئی اُڑا لے گیا۔ سبودھ نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ چہرے کا رنگ

فق ہوگیا۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ اس وقت انہیں کوئی دیکھتا تو سمجھتا کہ مہینوں سے بیمار ہیں۔ مداری لال نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا ــــ غضب ہوگیا اور کیا! آج تک کبھی ایسا اندھیر نہ ہوا تھا۔ مجھے یہاں کام کرتے دس سال ہوگئے۔ کبھی دھیلے کی چیز بھی غائب نہ ہوئی۔ میں نے آپ کو پہلے ہی روز آگاہ کردینا چاہا تھا کہ روپے پیسے سے ہوشیار رہیئے گا مگر شدنی تھی۔ خیال نہ رہا۔ ضرور باہر سے کوئی آدمی آیا اور نوٹ اڑا کر غائب ہوگیا۔ چپراسی کا بھی قصور ہے کہ اس نے کسی کو کمرے میں جانے ہی کیوں دیا۔ وہ لاکھ قسمیں کھائے کہ باہر سے کوئی نہیں آیا لیکن میں اسے مان نہیں سکتا۔ یہاں سے تو صرف پنڈت سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے۔ مگر دروازے ہی سے جھانک کر چلے آئے۔ سوہن لال نے صفائی دی ــــ میں نے تو اندر قدم بھی نہیں رکھا صاحب! اپنے جوان بیٹے کی قسم کھاتا ہوں جو اندر قدم بھی رکھا ہو۔

مداری لال نے پیشانی پر شکن دے کر کہا ــــ آپ فضول قسمیں کیوں کھاتے ہیں۔ کوئی آپ سے کچھ کہتا ہے۔ (سبودھ کے کان میں) بینک میں کچھ روپے ہوں تو نکال کر ٹھیکہ دار کو دے دیئے جائیں ورنہ بڑی بدنامی ہوگی۔ نقصان تو ہوگیا۔ اب اس کے ساتھ بے عزتی کیوں ہو۔

سبودھ نے پُر درد آواز میں کہا ــــ بینک میں مشکل سے دو چار سو روپے ہوں گے بھائی جان! روپے ہوتے تو کیا غم تھا۔ سمجھ لیتا جیسے پچیس ہزار اڑ گئے ویسے تیس ہزار اڑ گئے۔ یہاں تو کفن کو بھی کوڑی نہیں۔

اسی رات کو سبودھ نے خودکشی کر لی۔ اتنے روپے کا انتظام اُن کے لئے مشکل تھا۔ موت کے پردے کے سوا اپنی تکلیف اور اپنی مجبوری کے چھپانے کے لئے کوئی آڑ نہ تھی۔

(۴)

دوسرے روز علی الصباح چپراسی نے مداری لال کے گھر پہنچ کر آواز دی۔ مداری لال کو رات بھر نیند نہ آئی تھی گھبرا کر باہر آئے۔ چپراسی انہیں دیکھتے ہی بولا ــــ حضور! بڑا غضب ہوگیا۔ سیکرٹری صاحب نے رات کو اپنے گلے پر چھری پھیر لی۔

مداری لال کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔ منہ پھیل گیا اور تمام جسم لرز اٹھا۔ گویا ان کا ہاتھ بجلی کے تار پر پڑ گیا ہو

"چھری پھیر لی"؟

"جی ہاں! آج سویرے معلوم ہوا۔ پولیس والے جمع ہیں۔ آپ کو بلایا ہے"۔

"لاش ابھی پڑی ہوئی ہے"؟

"جی ہاں۔ ابھی ڈاکٹری ہونے والی ہے"۔

"بہت سے لوگ جمع ہیں"؟

"سب بڑے بڑے افسر جمع ہیں۔ حضور لاش کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔ کیسا بھلا آدمی تھا۔ سب لوگ رو

رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں۔ ایک سیانی لڑکی ہے۔ شادی کے لائق۔ بہو جی کو لوگ کتنا روک رہے ہیں۔ مگر بار بار دوڑ کر لاش کے پاس آجاتی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو رومال سے آنکھیں نہ پونچھ رہا ہو۔ ابھی اتنے ہی روز آئے ہوئے پر سب سے کتنی راہ ورسم ہوگئی تھی۔ روپے کی تو کبھی پروا ہی نہ تھی۔ دل دریا تھا۔

مداری لال کا سر چکرانے لگا۔ دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر اپنے کو سنبھال نہ لیتے تو شاید گر پڑتے۔ پوچھا۔ بہو جی بہت رو رہی تھیں؟

"کچھ نہ پوچھئے حضور۔ اور خت کی پتیاں جھڑی جاتی ہیں۔ آنکھیں پھول کر گولر ہوگئی ہیں۔"

"کتنے لڑکے بتائے تم نے ؟"

"حضور دو لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں"

"ہاں۔ ہاں لڑکوں کو تو دیکھ چکا ہوں۔ لڑکی سیانی ہوگی۔"

"جی ہاں۔ بیاہنے کے لائق ہے۔ روتے روتے بیچاری کی آنکھیں ورم کر آئی ہیں۔"

"نوٹوں کے بارے میں بھی بات چیت ہو رہی ہوگی۔"

"جی ہاں۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ دفتر کے کسی آدمی کا کام ہے۔ داروغہ جی تو سوہن لال کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ مگر شاید آپ سے مشورہ کر کے کریں گے۔ سیکریٹری صاحب تو لکھ گئے ہیں کہ میرا کسی پر شک نہیں ہے نہیں تو اب تک تہلکہ مچ جاتا۔ سارا دفتر پھنس جاتا۔"

"کیا سیکریٹری صاحب کوئی خط لکھ کر چھوڑ گئے ہیں ؟"

"ہاں معلوم ہوتا ہے کہ چھری چلاتے وقت یاد آیا کہ صبح دفتر کے سب لوگ پکڑ لئے جائیں گے۔ اس لئے کلکٹر صاحب کے نام خط لکھ دیا۔"

"خط میں میرے بارے میں کچھ لکھا ہے ؟ تمہیں کیا معلوم ہوگا !"

"حضور۔ میں کیا جانوں۔ مگر اتنا سب کہتے تھے کہ آپ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔"

"مداری لال کی سانس اور تیز ہوگئی آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں ٹپک پڑیں آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے۔ وہ اور میں ایک ساتھ پڑھے ہوئے تھے نندو! آٹھ دس سال تک ساتھ رہا۔ ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔ ساتھ کھاتے۔ ساتھ کھیلتے۔ بس اسی طرح رہتے جس طرح دو حقیقی بھائی رہتے ہوں۔ خط میں میری کیا تعریف لکھی ہے ؟ مگر تمہیں کیا معلوم ہوگا !

"آپ تو چل ہی رہے ہیں۔ دیکھ لیجئے گا۔"

"کفن کا انتظام ہو گیا ہے ؟"

"نہیں حضور! کہا نہیں کہ ابھی لاش کی ڈاکٹری ہوگی۔" مگر اب جلدی چلئے۔ ایسا نہ ہو دوسرا آدمی بلانے آتا ہو۔"

"ہمارے دفتر کے سب لوگ آگئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ اس محلے والے تو سبھی تھے۔"

پولیس والوں نے میرے بارے میں تو ان سے کچھ پوچھ گچھ نہیں کی۔

"جی نہیں کسی سے بھی نہیں کی"۔

مداری لال جب سبودھ چندر کے گھر پہنچے تو انہیں ایسا معلوم ہوا کہ سب لوگ ان کی طرف شک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے انہیں فوراً بلا کر کہا۔ آپ بھی اپنا بیان لکھا دیں۔ اور سب کے بیان تو لکھ چکا ہوں۔

مداری لال نے ایسے اطمینان سے اپنا بیان لکھوایا کہ پولیس افسر بھی دنگ رہ گئے۔ انہیں مداری لال پر کچھ کچھ شبہ ہوتا تھا مگر اس بیان نے اُن کا وہم بھی دور کر دیا۔ اسی وقت سبودھ کے دونوں لڑکے روتے ہوتے مداری لال کے پاس آئے اور کہا چلئے آپ کو اماں بلاتی ہیں۔ دونوں مداری لال سے مانوس تھے۔ مداری لال یہاں تو روز ہی آتے تھے مگر گھر میں کبھی نہیں گئے تھے۔ سبودھ کی بیوی اُن سے پردہ کرتی تھی۔ یہ بلاوا سُن کر ان کا دل دھڑک اُٹھا۔ کہیں اُس کا مجھ پر شبہ نہ ہو۔ کہیں سبودھ نے میری نسبت کوئی شک نہ ظاہر کیا ہو۔ کچھ جھجکتے کچھ ڈرتے اندر گئے۔ بیوہ کی دردناک گریہ وزاری سُن کر کلیجہ کانپ اٹھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس مظلومہ کے آنسوؤں کا کوئی دوسرا چشمہ جاری ہو گیا اور لڑکی تو دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔ دونوں لڑکوں نے بھی گھیر لیا۔ مداری لال کو ان سب کی آنکھوں میں ایسا عمیق رنج و غم بھرا ہوا معلوم ہوا کہ وہ اُن کی طرف دیکھ نہ سکے۔ اُن کا ضمیر انہیں ملامت کرنے لگا۔ جن بیچاروں کو ان پر اتنا اعتماد۔ اتنا بھروسا۔ اتنا تعلق۔ اُن کے گلے پر انہوں نے چھُری پھیری۔ انہیں کے ہاتھوں یہ بھرا پورا خاندان خاک میں مل گیا ان بیکسوں کا اب کیا حال ہو گا۔ لڑکی کی شادی کرنی ہے کون کرے گا۔ لڑکوں کی پرورش و پرداخت کا بار کون اٹھائے گا۔ مداری لال کو اتنی ندامت ہوئی کہ اُن کے منہ سے تسلی کا ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ میرے منہ میں کالکھ لگی ہوئی ہے۔ میرا قد پست ہو گیا ہے۔ انہوں نے جس وقت نوٹ اڑائے تھے انہیں وہم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ ہو گا۔ وہ صرف سبودھ کو پریشان کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ خانہ ویرانی کا نہ تھا۔ غمزدہ بیوہ نے سسکتے ہوئے کہا ـــ بھائی جی! وہ ہم لوگوں کو منجدھار میں چھوڑ گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ دل میں یہ بات ٹھان چکے ہیں۔ تو اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب ان کے قدموں پر ڈال دیتی۔ مجھے تو وہ یہی کہتے رہے کہ کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ آپ ہی کے ذریعہ وہ کوئی مہاجن ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ آپ پر ان کو اتنا بھروسا تھا۔ کہ بیان نہیں کر سکتی۔

مداری لال کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اُن کے گلے پر نشتر چلا رہا ہے۔ انہیں اپنے گلے میں کوئی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

رامیشوری نے پھر کہا ـــ رات کو سوتے وقت خوب ہنستے رہے۔ روز کی طرح دودھ پیا۔ بچوں کو پیار کیا۔ تھوڑی دیر ہارمونیم بجایا۔ پھر کلی کر کے لیٹے۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جو ذرہ بھر بھی شبہ ہوتا۔ مجھے فکرمند دیکھ کر بولے۔ تم فضول گھبراتی ہو۔ بابو مداری لال سے میری پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئے گی۔ میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں اُن کے سب سے مراسم ہیں۔ روپوں کا بندوبست آسانی سے ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کب دل میں یہ بات پیدا ہوئی۔ میں نصیبوں جلی ایسی سوئی کہ رات بھر سُنکی تک نہیں۔ کیا جانوں کہ وہ جان پر کھیل جائیں گے۔

مداری لال کو تمام دنیا آنکھوں میں تیرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انھوں نے بہت ضبط کیا مگر آنسوؤں کی رو کو نہ روک سکے۔ رامیشوری نے آنکھیں پونچھ کر پھر کہا ـــ بھیا جی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ لیکن آپ اس ظالم کا پتا ضرور لگائیے جس نے ہمارا سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔ یہ دفتر ہی کے کسی آدمی کا کام ہے۔ وہ دیوتا تھے۔ مجھے یہی کہتے رہے کہ میرا کسی پر شبہ نہیں ہے۔ مگر ہے یہ کسی دفتر والے ہی کا کام۔ آپ سے صرف اتنی التجا کرتی ہوں کہ اس ظالم کو بچ کر جانے نہ دیجئے گا۔ پولیس والے شاید اُسے کچھ رشوت لے کر چھوڑ دیں۔ آپ کو دیکھ کر ان کا یہ حوصلہ نہ ہوگا۔ اب ہمارے سر پر آپ کے سوا کون ہے۔ کس سے اپنا دکھ کہیں۔ لاش کی یہ حالت ہونی بھی لکھی تھی۔

مداری لال کے دل میں ایک بار ایسا جوش پیدا ہوا کہ سب کچھ ظاہر کر دیں۔ صاف کہدیں کہ میں ہی وہ ظالم وہ بے ایمان وہ مجرم ہوں۔ بیوہ کے پیروں پر گر پڑیں اور کہیں کہ وہی چھری اس ظالم کے گلے پر پھیر دو۔ مگر زبان نہ کھلی۔ اس حالت میں بیٹھے بیٹھے ان کے سر میں ایسا چکر آیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔

(۵)

سہ پہر کو لاش کی جانچ ختم ہوئی۔ ارتھی گھاٹ کی طرف چلی۔ سارا دفتر، تمام حکام اور ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ جلانے کی رسم لڑکوں کو کرنا چاہیئے تھی مگر وہ نابالغ تھے۔ اس لئے بیوہ چلنے کو تیار ہو رہی تھی کہ مداری لال نے جا کر کہا ـــ بھوجی۔ یہ رسم مجھے ادا کرنے دو۔ تم اس میں پھنس جاؤگی تو بچوں کو کون سنبھالے گا۔ سبودھ میرے بھائی تھے۔ زندگی میں اُن کے ساتھ کچھ سلوک نہ کر سکا، اب زندگی کے بعد مجھے دوستی کا حق ادا کر لینے دو۔ آخر میرا بھی تو ان پر کچھ حق تھا۔ رامیشوری نے رو کر کہا ـــ آپ کو بھگوان نے بڑا فراخ دل بنایا ہے بھیّا جی! نہیں تو مرنے پر کون کسی کو پوچھتا ہے۔ دفتر کے اور لوگ جو آدھی آدھی رات تک ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے جھوٹوں بات پوچھنے نہ آئے کہ ذرا ڈھارس ہوتی۔

مداری لال نے جلانے کی رسم ادا کی۔ تیرہ روز تک اس کو پورا کیا۔ تیرھویں روز پنڈدان ہوا۔ برہمن کھلائے گئے۔ محتاجوں کو غلّہ دیا گیا۔ دوستوں کی دعوت ہوئی۔ اور یہ سب کچھ مداری لال نے اپنے خرچ سے کیا۔ رامیشوری نے بہت کہا کہ آپ نے جتنا کیا اتنا ہی بہت ہے۔ اب میں آپ کو اور زیر بار نہیں کرنا چاہتی۔ دوستی کا حق اس سے زیادہ کوئی اور کیا ادا کرے گا۔ مگر مداری لال نے ایک نہ سُنی۔ سارے شہر میں ان کے حسنِ سلوک کی دھوم مچ گئی کہ دوست ہو تو ایسا ہو۔

سولھویں روز بیوہ نے مداری لال سے کہا ـــ آپ نے ہمارے ساتھ جو نیکی اور احسان کئے ہیں اُن سے ہم مرتے دم تک سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ آپ نے ہماری پُشت پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے ہماری کیا حالت ہوتی۔ کہیں روکھ کی بھی چھاؤں تو نہ تھی۔ اب ہمیں گھر جانے دیجئے۔ وہاں دیہات میں خرچ بھی کم ہوگا اور کھیتی باڑی کا سلسلہ بھی کر لوں گی۔ کسی نہ کسی طرح مصیبت کے دن گذر ہی جائیں گے۔ اسی طرح ہم پر نگاہ رکھئے گا۔

مداری لال نے پُوچھا— گھر پر کتنی جائداد ہے ؟

رامیشوری — جائداد کیا ہے۔ ایک کچا مکان ہے اور دس بارہ بیگھے کی کاشتکاری ہے۔ پکّا مکان بنوانا شروع کیا تھا۔ مگر روپے پورے نہ پڑے۔ ابھی ادھورا پڑا ہوا ہے۔ دس بارہ ہزار خرچ ہو گئے۔ اور ابھی چھت پٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

مداری — کچھ روپے بینک میں جمع ہیں یا بس کھیتی کا سہارا ہے ؟

بیوہ — جمع تو ایک پائی بھی نہیں ہے بھیّا جی۔ ان کے ہاتھ میں روپے رہنے نہیں پاتے تھے بس اسی کھیت کا سہارا ہے

مداری — تو ان کھیتوں میں اتنی پیداوار ہو جائے گی کہ لگان بھی ادا ہو جائے اور تم لوگوں کی گذر بسر بھی ہو۔

رامیشوری — اور کر ہی کیا سکتے ہیں بھیّا جی! کسی نہ کسی طرح زندگی تو کاٹنی ہی ہے۔ بچے نہ ہوتے تو میں زہر کھا لیتی

مداری — اور ابھی بیٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔

بیوہ — اس کی شادی کی اب کوئی فکر نہیں۔ کسانوں میں ایسے بہت مل جائیں گے جو کچھ لئے دیے بغیر شادی کر لیں گے۔

مداری لال نے ایک لحہ تک سوچ کر کہا۔ اگر میں کچھ مشورہ دوں تو اُسے مانیں گی آپ ؟

رامیشوری — بھیّا جی۔ آپ کی رائے نہ مانوں گی تو کس کی مانوں گی اور دوسرا ہے ہی کون ؟

مداری — تو آپ اپنے گھر جانے کی بجائے میرے گھر چلیے۔ جیسے میرے بال بچے رہیں گے ویسے آپ کے بھی رہیں گے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ایشور نے چاہا تو بیٹی کی شادی بھی کسی اچھے خاندان میں ہو جائے گی۔

بیوہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی — مگر بھیا جی سوچئے تو ...... مداری لال نے بات کاٹ کر کہا —— میں کچھ نہ سوچوں گا۔ اور نہ کوئی عذر سنوں گا۔ کیا دو بھائیوں کے خاندان ایک ساتھ نہیں رہتے؟ سبودھ کو میں اپنا بھائی سمجھتا تھا اور ہمیشہ سمجھوں گا۔

بیوہ کا کوئی عذر نہ سنا گیا۔ اسی روز مداری لال سب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اور آج دس برس سے اُن کی پرورش کر رہے ہیں۔ دونوں بچے کالج میں پڑھتے ہیں۔ اور لڑکی کی ایک اعلیٰ خاندان میں شادی ہو گئی ہے۔ مداری لال اور ان کی بیوی تن من سے رامیشوری کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مداری لال خدمت سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔

(ہندی سے ترجمہ)

ابو محمد امام الدین

محفلِ ادب

حسن و عشق

جی چاہتا ہے ہر دم ۔۔۔ دیکھا کروں تجھی کو
بیٹھے بٹھائے آخر ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے جی کو
حسرت نصیب دل کو ۔۔۔ رہتی ہے چاہ تیری
کیوں منتظر نگاہیں ۔۔۔ تکتی ہیں راہ تیری
روشن ہیں تیرے باعث ۔۔۔ راتوں کو خواب میرے
تو بھی کبھی کرم کر ۔۔۔ اے آفتاب میرے
تو وہ کہ شمع رخ سے ۔۔۔ سورج کو ماند کر دے
دیکھے جو مسکرا کر ۔۔۔ ذرّے کو چاند کر دے
پتھر کے سخت دل سے ۔۔۔ ہو جوئے نور پیدا
نورِ نگاہ سے ہو ۔۔۔ موجِ سرور پیدا
چہرے کی اک جھلک سے ۔۔۔ مدہوش کرنے والے
مخمور انکھڑیوں سے ۔۔۔ مے نوش کرنے والے
تو آ تری نظر سے ۔۔۔ تعلیم بے خودی لوں
یہ میکدہ سلامت ۔۔۔ اک جام میں بھی پی لوں

(ادبی دنیا)

ٹیگور کا فلسفہ

آٹھ سال کی عمر میں ایک لڑکا جو طوعاً و کرہاً مدرسہ میں داخل ہوا اُس نے اسے "قید خانہ" اور "خوفناک اسپتال" قرار دیا اور اس کے بعد اسے بلا تکلف خیرباد کہہ دیا جب یہ لڑکا اکتالیس برس کا آدمی ہو گیا تو اس نے خود ایک مدرسہ جاری کیا اور اکہتر برس کی عمر میں اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہے کہ یہ مدرسہ اپنی وسیع دلچسپیوں اور تعلیم و تربیت کے بے مثل سادہ اور

فطری اصولوں کی وجہ سے کل مہذب دنیا میں مشہور ومعروف ہے۔ یہ انسان رابندر ناتھ ٹیگور ہے اور اس کا مدرسہ شانتی نکیتن کی بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔

ٹیگور کو انگریزی زبان کے عجیب وغریب الفاظ سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ بارہ برس کی عمر میں وہ ایک روز انگریزی کے استاد سے سبق پڑھ رہا تھا۔ یہ استاد اپنے شاگرد کو انگریزی شاعری کی خوبی کا قائل کرنے کی انتہائی کوشش میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ انگریزی کے مستند شعرا کا کلام سنا رہا تھا۔ ٹیگور کو زور سے ہنسی آئی اور دیر تک ہنستا رہا۔

لیکن یہ بات اس استاد کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ چالیس سال بعد ۱۹۱۳ء میں اس کا شاگرد اپنی کتاب گیتانجلی میں انگریزی نثر کا ایسا طرز ایجاد کرے گا جو اپنی سادگی اور موسیقی اور نزاکت کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہوگا۔ ۱۹۱۳ء میں ٹیگور اپنی کتاب گیتانجلی کو جس میں بنگالی نظموں کا انگریزی ترجمہ تھا طفل مکتب کی مشقوں سے تعبیر کرتا تھا، لہذا جب یہ نظمیں لندن کی ایک ادبی مجلس میں پڑھی گئیں تو وہ دنگ رہ گیا۔ اس تمام شاعرانہ تخیل کے باوجود ٹیگور کے دل میں یہ خیال بھی نہ گزرا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر یہی کتاب اسے ادب کا نوبل پرائز دلوائے گی اور سارے عالم کی توجہ ادب ہند اور اس کی جدید تہذیبی نشاۃ الثانیہ کی جانب مرکوز کردے گی۔ ٹیگور کی کتابیں، جو پچپن سے زیادہ جلدوں پر مشتمل ہیں اور جن میں سے متعدد جلدوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے، آج ہر جگہ پڑھی جاتی ہیں اور حال ہی میں اس کی سترویں سالگرہ کے موقع پر دنیا کے تمام ملکوں سے آئن سٹائن، مہاتما گاندھی کیزرلنگ، رومین رولینڈ، ڈورانٹ جیسے ادیبوں، سائنسدانوں، مذہبی پیشواؤں اور بین الاقوامیوں نے اس کی خدمت میں تسلیم وتعریف کی نذریں بھیجیں۔ یہ نذریں ایک ضخیم جلد میں خوبصورت تصویروں اور ہندی مصوری کے نمونوں کے ساتھ ہندوستان میں "ٹیگور کی زریں کتاب" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔

ٹیگور کی کتابیں اور خاص کر وہ جو اخیر بیس سال میں لکھی گئی ہیں محض ادبی محاسن کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے مخصوص فلسفے کے اعتبار سے بے نظیر ہیں۔ یہ فلسفہ ایک مجتہدانہ شان رکھتا ہے۔ ٹیگور کے فلسفہ نے اس کی زندگی کے ساتھ ایک بڑھتے ہوئے پودے کی طرح نشوونما پائی ہے اور انسانی تخیل کے زرق برق ہرے بھرے اور نازک شگوفوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کی زمین ٹیگور کی باطنی انتہائی حساس اور حسن کارانہ فطرت تھی۔ اس کا بیج ہندوستان کے فلسفیانہ نغموں یعنی پانچ ہزار سالہ قدیمی اپنشدوں سے لیا گیا تھا۔ اس کی آبیاری سولھویں صدی کے بنگالی الہامی شاعروں کے مذہبی عشق کے نغموں کے سرچشمے سے ہوئی تھی۔ اس کے فلسفے نے ایک وقت سکوت وبیخبری کے ساتھ اپنے والد کے دور افتادہ صحرائی مقامات کی فضا میں (جہاں ٹیگور رہا کرتا تھا)، کوہ ہمالیہ کی مستانہ رنگ اور لہراتی ہوئی، جھومتی ہوئی شاندار بلندیوں میں (جس کا اس نے معائنہ کیا تھا) اور درخشاں غروب آفتاب اور عمیق نیلگوں آسمان کی فضا میں (جسے وہ بنگال میں بہنے والی پدما ندی میں آہستہ آہستہ چلنے والی کشتی میں لیٹا ہوا دیکھا کرتا تھا) پرورش وتربیت ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان کی فطرت سے بے جان نباتاتی اور حیاتیاتی افراط کے مجموعے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک قابل الفت اور الفت کرنے والے شخص کی حیثیت سے محبت رکھتا تھا۔ قبل اس

کے کہ اس نے فطرت کے ساتھ ایک فلسفی کی متفکرانہ حقیقت کے ساتھ محبت کرنا سیکھا اسے ایک شاعر کی پرجوش حقیقت کے ساتھ اس کا پریم تھا۔

تیس برس تک اپنے جذبیلے اور جوشیلے ایام میں اس کا موضوع انسانی محبت اور زندگی اور فطرت کی روحانی اشکال تھیں۔ لیکن ایک صبح کہ جب وہ طلوع آفتاب کا نظارہ کر رہا تھا، روحانی بیداری کے طور پر ایک باطنی روشنی اس پر نمودار ہوئی جس نے اسے اپنے مقصدِ عظیم سے باخبر کر دیا۔ ساری کائنات کے کمال، حسن اور اتحاد کی تفصیل اور احساس کو اپنے اس تجربے کو وہ پُرزور طریقے سے اپنی نظم "آبشار نے اپنے خواب سے بیدار کر دیا گیا" میں قلمبند کرتا ہے میں ——— آزاد شدہ میں ——— اپنے چاروں طرف نزاکت کی بوچھاڑ کر دوں گا، پریشان زلفوں اور اپنے ہاتھ میں ایک پھول لے کر اور ایک ایسی ضیا کے کے ساتھ جو سورج کو بھی ماند کر دے گی، میں قوس قزح کے بازوؤں پر سوار ہو کر جاؤں گا اور کوہ بکوہ اور سیارہ بہ سیارہ سیاحت کروں گا، یا میں دریاؤں کی شکل اختیار کر لوں گا، اور اپنا پیغام، اپنا راگ سنانے کے لئے ملکوں ملکوں بہنا اختیار کروں گا، کوئی ناقابل اظہار واقعہ پیش آیا ہے۔ میری ساری ہستی بیداری سے درد پیدا کر رہی ہے اور میں فاصلے پر بحرِ عظیم کی صدا سن رہا ہوں۔ ہاں وہ پکار رہا ہے! وہ پکار رہا ہے! بحرِ عظیم پکار رہا ہے۔ ...." بحرِ عظیم سے سارے انسان مراد ہو سکتے ہیں یا خدا۔

ٹیگور اپنی خود نوشت سوانح حیات میں رقمطراز ہے کہ وہ واقعہ اس کی زندگی میں نہایت انقلاب انگیز ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس کی تصنیفات میں محاکمانہ فلسفیانہ اور مذہبی رنگ غالب ہو گیا۔ یہ واقعہ اس کے بعد کی عملی بین الاقوامیت کا دھندلا سا آغاز بھی تھا۔ اس کی شاعری نے خدائے برتر کی خدمت شروع کی جسے وہ ابدی انسان سے تعبیر کرتا ہے کہ ایک فرد اس میں وصل ہو کر اپنی تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ٹیگور مسیح، بدھ یا افلاطون نہیں ہے ——— نہ وہ اس کا مدعی ہے۔ مقابلہ اور موازنہ نفرت خیز اور بے سود ہوتا ہے۔ وہ خود کو ایک شاعر، ایک مغنی کہتا ہے ——— حسن، عشق، خدا اور انسان ——— کے گیت گانے والا مغنی، ان راگوں کا گانے والا جو انسان کی عمیق ترین گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ گیت جس کا نغمہ انسان کو متحد کرتا ہے، منتشر نہیں کرتا۔ اس کی نثر منثور شاعری ہے۔

اس کا فلسفیانہ پیغام اس کی کتاب "سادھنا" میں خصوصیت کے ساتھ درج ہے اور بہت سی کتابوں میں وضاحت اور تسلسل کیساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس کا اختتام اس کی تازہ ترین کتاب "انسان کا مذہب" جو آکسفورڈ کے لکچروں پر مشتمل ہے، میں ہے۔ دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی ٹیگور ذات (Personality) کے شگفتہ حسن کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا فلسفہ وحدتِ ذاتی (Personalistic Monism) ہے۔ انسان ایک ذات ہے اور یہ کائنات بھی ایک ذات ہے۔ ہر اچھی حسین اور سچی چیز اس شخص کی تعلق کی وجہ سے اچھی حسین اور سچی ہے جو اسے مشاہدہ کرتا

A Waterfall awakened from its Dream.

ہے۔ مگر ہماری ذات کی حقیقت اپنے سطحی اظہار میں نہیں ملتی بلکہ ذات ایزدی کے عمق میں ملتی ہے اور وہ ذات ایزدی طبعی اتحاد کا ایک مربوط اصول ہے۔ اس کی فطرت مسرت ہے اور مسرت کا سرچشمہ آزادی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز مسرت میں پیدا ہوتی ہے۔ مسرت میں رہتی ہے اور مسرت میں مدغم ہو جاتی ہے حالانکہ ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی جب ہم باطنی مسرت کے ذریعہ سے آزادی حاصل کرتے ہیں تو ہم خدا کے نزدیک پہنچتے ہیں اور باطنی آزادی ہمیں اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ ہم کائنات سے اپنی عمیق حسیات سے محبت کرتے ہیں۔ یہ آزادی اپنی ادنیٰ ذات کو سب کچھ سمجھ کر اس سے محبت کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اخوت انسانی فقط انسان کے روحانی اتحاد کے احساس کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ اتحاد خدا ہے یا ابدی انسان۔ اور یہ احساس جمالیاتی تخیل اور خاموش فکر کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے یا ہماری اندرونی ذات یا دھرم کے احکام کے مطابق عملی کام کرنے سے بہم پہنچتا ہے۔

——— مشرق اور مغرب کے تعلقات پر اس نے لندن میں ایک ضیافت کے موقع پر جس میں انگلستان کے بڑے بڑے اہل دماغ موجود تھے، روشنی ڈالی تھی۔ اس نے کہا تھا "مشرق مشرق ہے مغرب مغرب ہے خدا نہ کرے کہ اس کے خلاف ہو ——— مگر دونوں دوستی، صلح اور مفاہمت کے ساتھ ضرور ملیں گے اور ان کا ملنا ان کے فرق کی وجہ سے زیادہ بار آور ثابت ہو گا اور انسانیت کی عام قربان گاہ پر دونوں کے مقدس اندوختے کو عمل میں لانے کا باعث ہو گا۔

ٹیگور بے معنی رہبانیت اور ترک دنیا میں اعتماد نہیں رکھتا۔ وہ محدود میں لامحدود کے اظہار و مسرت کے احساس کا تمنائی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ترک دنیا میں میری نجات مضمر نہیں۔ میں حسرت کے ہزار قید و بند میں آزادی سے ہم کنار ہوتا ہوں تو میرے لئے ہمیشہ رنگین و معطر شراب کے جام انڈیلتا ہے اور اس مٹی کے برتن کو لبریز کر دیتا ہے"

میری دنیا تیرے شعلے سے سینکڑوں طرح کے چراغ روشن کرے گی اور اسے تیرے مندر کی قربان گاہ کے سامنے رکھے گی۔

"نہیں میں اپنے حواس کا دروازہ بند نہیں کروں گا۔ دیکھنے، سننے اور چھونے کی مسرتیں تیری مسرت اٹھائیں گی "ہاں، میری ساری مایا مسرت کی روشنی میں جلے گی اور میری تمام خواہشیں پک کر محبت کے ثمر بن جائیں گی

دوسری جگہ وہ کہتا ہے:۔

میرے آقا تجھ سے میری یہی دعا ہے۔ میرے قلب کے افلاس کی بیخ کنی کر مجھے اپنی مسرتوں اور رنجوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کرنے کی قوت عطا فرما۔ مجھے وہ قوت بخش کہ اپنے دماغ کو روز کی لغویات سے بلند و بالا بناؤں میں محبت کو خدمت میں بار آور بنا سکوں مجھے قوت عطا فرما کہ میں غریبوں کو نہ چھوڑوں اور

پُرغرور طاقت کے سامنے سر نہ جھکاؤں۔ مجھے وہ طاقت عطا فرما کہ میں اپنے دماغ کو روز کی لغویات سے بلند و بالا بنا لوں، اور مجھے وہ قوت بخش کہ میں محبت کے ساتھ اپنی قوت کو تیری مشیت کا مطیع بنالوں۔"

ذیل کے اشعار میں وہ فطرت کے حسن میں خدا کی ذات اور خدائی کی عام قابلیتِ اظہار کے متعلق بیان کرتا ہے۔

"تو ہی آسمان ہے اور تو ہی آشیانہ ہے۔ اے حسین! تیرے آشیانے میں تیری محبت موجود ہے، جو روح کو رنگوں، آوازوں اور خوشبوؤں سے محصور کر لیتی ہے۔ صبح اپنے سیدھے ہاتھ میں سنہری ٹوکری اٹھائے ہوئے اور حسن کا ہار لیئے ہوئے خموشی کے ساتھ زمین کو تاج پہنانے کے لئے آرہی ہے اور شام بغیر پگڈنڈیوں کے راستوں میں ہوتی ہوئی آسائش کے مغربی سمندر سے اپنے سنہری گھڑے میں امن کی ٹھنڈی شراب لئے ہوئے ان تنہا میدانوں میں آموجود ہوتی ہے، جنہیں گلوں نے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اس جگہ جہاں کہ بے پایاں آسمان روح کی پرواز کے لئے پھیلا ہوا ہے، سفید ضیا کی حکمرانی ہے۔ نہ رات ہے نہ دن، نہ شکل ہے نہ رنگ اور لفظ کا تو نام و نشان بھی نہیں"۔ (علی گڑھ میگزین)

دو بھائی

رام پرشاد اور لچھمن پرشاد دو بھائی تھے۔ کل یُگ میں پیدا ہو کر بھی وہ زمانے کے نزدیک ست یُگی تھے۔ دونوں کا آپس میں وہی سلوک تھا جو دوسروں کے ساتھ تھا۔

دونوں بھائیوں میں بڑا اتفاق تھا۔ جائداد ایک تھی۔ گھر ایک تھا، آمدنی ایک ہی جگہ رکھی جاتی تھی اور خرچ بھی ایک ہی ہاتھ سے ہوتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے بچے بھی تھے۔ انہیں وہ دونو بھائی اس طرح رکھتے تھے کہ اور لوگوں کے لئے یہ بتانا مشکل تھا کہ کونسا بچہ کس کا ہے جو دیکھتا وہ دونوں بھائیوں کو ان کی محبت پر مبارکباد دیتا مگر وہ تھے دونو کل یُگی بھائی ہی۔

امرود کا باغیچہ تھا۔ وہیں دونوں بھائی اکثر شام کو ٹہلنے جاتے تھے۔ ایک دن ان دونوں کے بچے بھی ساتھ تھے۔ وہاں پہنچ کر رام پرشاد نے دو امرود توڑے۔ ان میں سے ایک بڑا تھا ایک چھوٹا۔ لڑکے رام پرشاد سے کچھ دور دوڑ رہے تھے۔

"تو بیٹا امرود" انہوں نے دونو کو پکار کر کہا" اور ایک ایک امرود اپنے ایک ایک ہاتھ میں لے کر ہاتھ بڑھا دیئے۔

لڑکے خوش ہو کر ان کی طرف دوڑے۔ ان کا لڑکا بائیں ہاتھ والے امرود کی طرف تھا اور بھتیجا دائیں طرف جب لڑکے پاس آ گئے انہوں نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ لیا اور بڑا امرود اپنے لڑکے کو دے دیا۔

ان کے من میں چور تھا۔ گھوم کر دیکھا لچھمن نفرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رام پرشاد نے جھینپ کر آنکھیں نیچی کر لیں اور گھبرا کر کانپ سے گئے۔

لڑکوں نے جن پر کل یُگ کا اثر نہیں تھا۔ اس معمولی بات پر دھیان بھی نہ دیا۔ وہ خوشی خوشی امرود کھاتے رہے۔ (چندن)

خمستان

زیرِ طبع

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر نقاشِ فطرت حضرت خواجہ عبدالسمیع پال اثرؔ صہبائی ایم اے ایل ایل بی وکیل سیالکوٹ ہائیکورٹ جموں وکشمیر کا نام نامی دنیائے ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپکا کیف انگیز کلام ملک کے بہترین رسائل میں شائع ہوکر اربابِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا ہے۔ اس سے قبل آپ کی رباعیات و قطعات کا ایک مختصر سا مجموعہ جامِ صہبائی کے نام سے شائع ہوکر ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکا ہے معارف، اردو، ہمایوں، ساقی اور پیشوا وغیرہ میں بہترین تبصرے شائع ہوچکے ہیں۔ اخبارات۔ ٹریبیون (انگریزی) انقلاب اور زمیندار نے بھی اس مجموعہ کو ادبِ اردو میں ایک گرانقدر اضافہ قرار دیا ہے۔ مشاہیر نقادانِ فن نے حضرت اثرؔ کے ادبی کمالات کا اعتراف کیا ہے۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ ایڈیٹر معارف اعظم گڑھ نے حضرت اثرؔ کو اردو کا خیام اور سحابی قرار دیا ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار لکھنؤ نے حضرت اثرؔ کی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے اس مجموعہ کو حقیقی معنوں میں "خمستان" تصور فرمایا ہے۔ علامہ کیفی دہلوی نے حضرت اثرؔ کو جدید شاعری کا سربرآوردہ علمبردار بیان فرمایا ہے۔

چوہدری خوشی محمد صاحب ناظرؔ کے الفاظ ہیں "یہ رباعیات اردو زبان میں ایک نادر اور ہمیشہ زندہ رہنے والی چیزیں ہیں"۔

حال ہی میں اکثر احباب کے اصرار پر حضرت ممدوح نے اپنے کلام کا مجموعہ "خمستان" کے نام سے مرتب فرمایا ہے جو مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے۔

(۱) تجلیات حافظ شیرازی کی رندی و مستی، اقبالؔ کی حیات افروز اور حقائق آفریں نغمہ سرائی۔ غالبؔ کی ژرف نگاہی اور میرؔ کے سوز و گداز کو یکجا کرکے حضرت اثرؔ نے اردو غزل میں نئی روح پھونک دی ہے۔

(۲) سمن زار۔ قریباً پچاس نظموں کا مجموعہ ہے جنمیں ستارۂ صبح خمستان، بہار، تاروں بھری رات، ملائے جا، پی اور پلا ساقی، پھول اور ستارہ، کائنات اور انسان اور عالم افسردگی خاص طور پر مقبول ہوچکی ہیں۔ انہی نظموں سے متاثر ہوکر ایڈیٹر ہزار داستان لاہور نے حضرت اثرؔ کو ورڈز ورتھ، کیٹس اور شیلے کا ہم پایہ قرار دیا تھا۔

(۳) جامِ صہبائی علامہ کیفی دہلوی کے الفاظ ہیں "جامِ صہبائی حقیقت میں مناظرِ قدرت کی زرنگاریوں، حسن و عشق کی نغمہ سرائیوں، بادۂ عرفان کی سرمستیوں اور فلسفہ و حکمت کی حقائق آرائیوں کا روح افزا مجموعہ ہے۔

(۴) راحت کدہ۔ اس میں چار سو کے قریب اشعار ہیں شاعر نے یہ اشعار اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات "راحت" کے غم میں ڈوب کر لکھے ہیں۔ یہ اشعار خود شاعر کے الفاظ ہیں "وائہائے فرقت کے چند پھول، اشکہائے محبت کے چند موتی اور سازہائے غم کے چند نغمے ہیں۔

(۵) ستارے:- ایک سو کے قریب منتخب متفرق اشعار ہیں۔

خمستان کا سائز ۲۲×۱۷ رکھا گیا ہے۔ کتابت نہایت اہتمام کے ساتھ ایک بہترین کاتب و آرٹسٹ کے سپرد کی گئی ہے ضخامت قریباً اڑھائی سو صفحات ہوگی۔ طباعت اقبال برقی پریس سیالکوٹ میں طباعت و اشاعت کے لئے بھیج دی گئی ہے۔ تشنگانِ بادۂ سخن سے امید ہے کہ وہ خمستان کی اشاعت میں پورے شوق سے کام لیں گے۔

قیمت مجلد عہ غیر مجلد عمر قبل از اشاعت جو حضرات اپنے اسمائے گرامی خریداروں کی فہرست میں شامل کرادینگے اُن سے رعایتی قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲ر لیجاوے گی۔

المشتہر

مینجر آزاد بک ڈپو سیالکوٹ

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم چونسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۳/ (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور